# تدبرِ قرآن

۴۵

# الجاثية

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

## ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

یہ سورہ نام، تمہید اور بنیادی مطالب میں سابق سورہ کا مثنیٰ ہے۔ فرق ہے تو اجمال و تفصیل کا ہے۔ اس میں قریش کو صاف الفاظ میں دھمکی دی گئی ہے کہ توحید اور قیامت کے دلائل سے آسمان و زمین کا ہر گوشہ معمور ہے اور ان کی تفصیل اللہ نے اپنی اس کتاب میں بھی بیان کر دی ہے۔ اگر یہ دلیلیں تمھاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں تو دنیا کی کوئی چیز بھی تمھاری سمجھ میں نہیں سکتی۔ اب تمھارا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہی تمھارا فیصلہ فرمائے گا۔

مسلمانوں کو اس میں صاف الفاظ میں فتح و غلبہ کی بشارت دی گئی ہے کہ کچھ دنوں صبر کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرو۔ اگر استقلال کے ساتھ تم اپنے موقف پر ڈٹے رہے تو آخری کامیابی تمھارا ہی حصہ ہے۔ اس راہ میں جو مصیبتیں بھی تم جھیلو گے وہ رائگاں نہیں جائیں گی بلکہ اللہ تعالیٰ ان کا بھرپور صلہ دے گا۔

یہ سورہ اس دور کی سورتوں میں سے ہے جب یہود کھلم کھلا قریش کی پیٹھ ٹھونکنے لگ گئے تھے۔ اس وجہ سے اس میں یہود کو بھی نہایت واضح الفاظ میں ملامت ہے کہ اللہ نے ان کو امامت کے جس منصب پر فائز فرمایا تھا اپنی شامتِ اعمال سے انھوں نے اس کو ضائع کر دیا۔ اب ان کا معاملہ اللہ کی عدالت میں پیش ہو گا اور وہی ان کا فیصلہ فرمائے گا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ تنبیہ ہے کہ اللہ نے جو روشن شاہراہ تم کو دکھائی ہے اس پر چلو اور ان دین بازوں سے ہوشیار رہو۔ یہ زور لگا رہے ہیں کہ اپنی ایجاد کردہ بدعات میں مبتلا کر کے تمھیں بھی اللہ کی راہ سے اس طرح محروم کر دیں جس طرح وہ خود محروم ہو بیٹھے ہیں۔

## ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۶) یہ قرآن خدائے عزیز و حکیم نے نہایت اہتمام سے اتارا ہے۔ جس توحید کی یہ دعوت دے رہا ہے اور جس روزِ جزا و سزا سے یہ ڈرا رہا ہے اس کے دلائل آسمان و زمین کے چپہ چپہ میں موجود ہیں۔ انسان کی خلقت، رات اور دن کی آمد و شد، بارش کے نزول، زمین میں اس کی برکات کے ظہور اور ہواؤں کی گردش، ہر چیز کے اندر توحید اور معاد کی نہایت واضح نشانیاں موجود ہیں بشرطیکہ لوگ غور کریں اور غور کرنے کے بعد جو نتائج سامنے آئیں ان کو تسلیم کرنے کا ان کے اندر ارادہ پایا جاتا ہو۔ یہی حقائق قرآن پیش کر رہا ہے۔ اگر یہ واضح باتیں

لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں تو ان کے بعد وہ کون سی بات ہے جس کو یہ سمجھیں اور مانیں گے!

(۷ - ۱۱) شرک کے سرغنوں کو وعید جنھوں نے بالکل جھوٹ، موٹ ایک دین گھڑ کے کھڑا کیا اور اب اس کی حمایت میں ایسے اندھے بہرے بن گئے ہیں کہ اللہ کا کلام سننے کے روادار نہیں ہیں۔ اگر اللہ کا کلام ان کو سنایا جاتا ہے تو تکبّر کے ساتھ اس طرح چل دیتے ہیں گویا کوئی بات انھوں نے سنی ہی نہیں۔ اگر کسی بات کے متعلق انھیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دلوں پر اثر انداز ہونے والی ہے تو اس کو مذاق بنا لیتے ہیں تاکہ اس طرح اس کو بے وزن کر دیں۔ یہ لوگ، یاد رکھیں کہ ان کا یہ استکبار ان کے لیے باعث رسوائی ہوگا اور جب ان کو جہنم سے سابقہ پیش آئے گا تو اس وقت نہ ان کا وہ اندوختہ ان کے کچھ کام آئے گا جو حرام راستوں سے انھوں نے حاصل کیا ہے اور نہ ان کے وہ مزعومہ شرکا ہی ان کی کوئی مدد کر سکیں گے جو اللہ کے سوا انھوں نے گھڑ رکھے ہیں۔

(۱۲ - ۱۵) توحید کے بعض دلائل کا بیان ایک نئے اسلوب سے اور مسلمانوں کو صبر و استقامت کی تلقین کہ وہ مشرکین کی ژاژخائی کی مطلق پروا نہ کریں بلکہ اپنے مؤقف پر ڈٹے رہیں۔ اگر مخالفین ان کی بات نہیں مانیں گے تو اپنا ہی بگاڑیں گے، اس سے اہل ایمان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

(۱۶ - ۲۰) بنی اسرائیل کے حال پر اظہارِ افسوس کہ اللہ نے ان کو حکومت، نبوت، وسعت رزق سے نوازا اور قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز فرمایا لیکن انھوں نے ان نعمتوں کا حق ادا نہیں کیا بلکہ باہمی حسد و عداوت کے سبب سے خدا کے دین میں اختلاف برپا کیا۔ مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ اب اللہ نے بنی اسرائیل سے اپنی شریعت کی امانت واپس لے کر تمھارے حوالہ کی ہے تو تم ان کی گمراہیوں سے بچنا اور اللہ کے دین پر استوار رہنا۔ اس وقت یہود اور مشرکین نے تمھارے خلاف جو گٹھ جوڑ کر رکھا ہے اس سے ذرا مرعوب نہ ہونا۔ اللہ کی تائید بہرحال ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اس سے ڈرنے والے ہیں۔

(۲۱ - ۳۷) قیامت کے باب میں منکرین قیامت کے بعض شبہات کا ازالہ۔ اس دن قیامت کے مکذبین کا جو حال ہوگا اس کی تصویر۔ آخر میں توحید کے مضمون کا پھر اعادہ۔

# سُورَةُ الْجَاثِيَةِ (٤٥)

مَكِّيَّةٌ —— آيات: ٣٧

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آيات ١-١٥

حٰمٓ ﴿١﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿٢﴾
اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٣﴾ وَفِيْ
خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿٤﴾ وَ
اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ
رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ
اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿٥﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ
بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٦﴾ وَيْلٌ
لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿٧﴾ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ
مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٨﴾ وَاِذَا
عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
مُّهِيْنٌ ﴿٩﴾ مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا
شَيْـًٔا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠﴾
هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ

ع ۱۱ ۱۷ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ
الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾
وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا
لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا
يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ
فَعَلَيْهَا ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۵﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۵

یہ حٰمٓ ہے۔ اس کتاب کی تنزیل خدائے عزیز و حکیم کی طرف سے ہے۔ آسمانوں اور زمین میں ایمان لانے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور اسی طرح خود تمھاری خلقت اور حیوانات کے اندر بھی، جو اس نے زمین میں پھیلا رکھے ہیں، ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو یقین کرنا چاہیں۔ اور رات اور دن کی آمد و شد میں اور اس ذریعۂ رزق میں جو اللہ آسمان سے اتارتا ہے، پھر اس سے زمین کو زندہ کر دیتا ہے اس کے مر جانے کے بعد، اور ہواؤں کی گردش میں بھی بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھیں۔ ۱ - ۵

یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمھیں بالکل حق کے ساتھ سنا رہے ہیں تو اللہ اور اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے! ہلاکی ہے ہر اس لپاٹیے گنہگار کے لیے جو اللہ کی آیتیں سنتا ہے، اس کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں، پھر وہ استکبار کے ساتھ اپنی روش پر ضد کرتا ہے گویا اس نے وہ سنی

ہی نہیں۔ تو ان کو ایک دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔ اور جب اس کو ہماری آیات میں سے کسی بات کا علم ہوتا ہے تو اس کو مذاق بنا لیتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ آگے ان کے جہنّم ہے اور جو چیزیں انھوں نے کمائی ہیں وہ ان کے ذرا کام آنے والی نہیں بنیں گی اور نہ وہی ان کے کام آنے والے بنیں گے جو اللہ کے سوا انھوں نے اپنے لیے کارساز بنا رکھے ہیں۔ اور ان کے لیے ایک بڑا عذاب ہوگا۔ یہ اصل ہدایت ہے اور جنھوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا تو ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے کپکپی پیدا کر دینے والی نوعیت کا۔ ۶ - ۱۱

اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے سمندر کو ساز گار بنا دیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو اور تاکہ تم اس کے شکر گزار رہو۔ اور اسی نے تمھاری خدمت میں لگا رکھا ہے ان چیزوں کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب کو اپنی طرف سے۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔ ۱۲ - ۱۳

ایمان والوں سے کہہ دو کہ ان لوگوں سے درگزر کریں جو خدا کے بڑے دنوں کے ظہور کے متوقع نہیں ہیں تاکہ اللہ ایک قوم کو اس کا پورا پورا بدلہ دے جو وہ کرتی رہی ہے۔ جو کوئی نیک عمل کرے گا تو اس کا نفع اسی کے لیے ہے اور جو برائی کرے گا تو اس کا وبال اسی پر آئے گا۔ پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۴ - ۱۵

# ۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۱-۲)

اس سورہ کا بھی قرآنی نام حٰمٓ ہی ہے۔ اس نام سے موسوم سورتوں کے مطالب کے اشتراک اور ان کے مزاج کی ہم رنگی پر پچھلی سورتوں کی تفسیر میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔

سورہ کی تمہید

'تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ ..... الآیۃ' سابق سورہ کی طرح اس سورہ کی تمہید میں بھی قرآن کی عظمت و اہمیت کا حوالہ ہے البتہ اس میں اہمیت کے بیان کا پہلو سابق سورہ سے مختلف ہے۔ لفظ 'تَنْزِيْل' پر ہم اس کے محل میں بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ اس کے اندر تدریج و اہتمام کا مفہوم پایا جاتا ہے اور قرآن کے اتارے جانے کے معاملے میں اللہ نے جو اہتمام خاص ملحوظ رکھا ہے اس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اس اہتمام خاص کے ذکر کے ساتھ ساتھ اپنی دو صفتوں ــ عزیز اور حکیم ــ کا حوالہ دیا ہے۔ 'عزیز' کے معنی غالب و مقتدر کے ہیں اور 'حکیم' اس کو کہتے ہیں جس کے ہر قول و فعل میں حکمت ہو۔ ان دونوں صفتوں کے اجتماع سے یہاں دو باتیں واضح ہوئیں۔

صفات 'عزیز' و 'حکیم' کے مقتضیات

ایک یہ کہ جس خدا نے یہ کلام اس اہتمام کے ساتھ اتارا ہے وہ کوئی ضعیف، ناتواں اور عاجز و بے بس ہستی نہیں ہے بلکہ تمام کائنات کا اختیار و اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں بلکہ تمام کائنات کے مالکِ حقیقی کا فرمانِ واجب الاذعان ہے اگر اس کا کما حقہٗ احترام نہ کیا گیا تو لوگ یاد رکھیں کہ جب وہ لوگوں کو پکڑے گا تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ بن سکے گا۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ عزیز اور غالب و مقتدر ہونے کے ساتھ ساتھ 'حکیم' بھی ہے۔ اس وجہ سے اس کا ہر قول و فعل حکمت پر مبنی ہے۔ اس کی حکمت کی شان اس کے اس حکیمانہ کلام سے واضح ہے بشرطیکہ لوگ اس پر غور کریں۔ اس کی حکمت ہی کی ایک شان یہ بھی ہے کہ اگرچہ ناقدرے اور ناشکرے اس کے کلام اور اس کے رسول کی توہین کر رہے ہیں لیکن وہ غالب و مقتدر ہونے کے باوجود ان کے پکڑنے میں جلدی نہیں کر رہا ہے بلکہ ان کو مہلت پر مہلت دیے جا رہا ہے تاکہ جن کے اندر کچھ صلاحیت ہے وہ اپنی اصلاح کر کے اپنے آپ کو اللہ کی رحمت کا مستحق بنا لیں اور جو اپنی صلاحیتیں برباد کر چکے ہیں ان پر اللہ کی حجت پوری ہو جائے۔ حساب کے دن وہ کوئی عذر نہ کر سکیں۔

اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۳)

قرآن کی دعوت کے حق میں آفاق کے دلائل

یہ قرآن کی دعوتِ توحید اور اس کے انذارِ قیامت کے حق میں آفاق کے دلائل کی طرف اشارہ ہے تاکہ اس کا حکیمانہ کلام ہونا واضح ہو۔ فرمایا کہ قرآن لوگوں کو جس چیز کی طرف بلا رہا ہے اور جس چیز سے ڈرا رہا ہے اس کی نشانیاں آسمانوں اور زمین کے چپہ چپہ میں موجود ہیں لیکن یہ نشانیاں کارآمد اُن

لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان لانے والے ہوں۔ جو لوگ ایمان لانے والے نہ ہوں وہ سب کچھ دیکھ کر بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں اور روز نئی نئی نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور اگر ان کی طلب کے مطابق کوئی نئی نشانی دکھا بھی دی جائے تو اس سے بھی وہ قائل نہیں ہوتے بلکہ کسی دوسری نشانی کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں۔ اصل چیز انسان کا ارادہ ہے۔ اگر اس کے اندر حقیقت کی جستجو اور منزل کی طلب ہو تو خالقِ کائنات نے منزلِ مقصود کی نشان دہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ آسمانوں میں بھی جگہ جگہ سگنل اشارے دے رہے ہیں اور زمین بھی قدم قدم پر رستہ دکھا رہی ہے لیکن جو لوگ اپنی خواہشوں ہی کے پیچھے بھٹکنا چاہتے ہیں ان کو نہ آسمان کے سگنل نظر آتے اور نہ زمین کے نشانات۔ وہ ہمیشہ آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں اور اسی آوارہ گردی میں ان کی زندگیاں گزر جاتی ہیں۔

وَفِیْ خَلْقِکُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (۴)

انسان کی خلقت کے اندر جو نشانیاں ہیں ان کی طرف اشارہ

آسمانوں اور زمین کی نشانیوں کی طرف ایک جامع اشارہ کرنے کے بعد خود انسان کی خلقت اور اس کی پرورش کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں جو اہتمام فرمایا ہے اس کی طرف توجہ دلائی کہ انسان اگر اپنی ہی خلقت کے تمام اطوار و مراحل پر غور کرے تو اس پر خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کے وہ حقائق واضح ہوں گے کہ اس کے لیے نہ خالق کی توحید میں کسی شبہ کی گنجائش باقی رہے گی نہ امکانِ معاد میں اور نہ جزا و سزا کے لازمی ہونے میں۔ جس خالق نے انسان کو مٹی سے اور پھر پانی کی ایک بوند سے ایسی اعلیٰ صورت بخش دی اس کے لیے اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیوں مشکل ہو جائے گا؟ جس پروردگار نے انسان کی پیدائش کے بالکل ابتدائی مرحلہ سے لے کر اس کے آخری مرحلہ تک پرورش کا یہ انتظام فرمایا آخر وہ اس کو بالکل غیر مسئول کس طرح چھوڑ دے گا۔ جو انسان اتنی اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ وجود میں آیا ہے آخر اس کی صلاحیتوں کے باب میں اس سے پرسش کیوں نہیں ہوگی؟ پھر یہ کہ جس انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے تمام اضداد اور تمام اجزائے مختلفہ کو ساز گار بنایا آخر اس کی کیا شامت آئی ہوئی ہے کہ وہ اس کی عبادت میں کسی دوسری چیز کو شریک کرے؟

سامانِ پرورش کی نشانیوں کی طرف اشارہ

'وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ' میں اشارہ اس سامانِ ربوبیت کی طرف ہے جو اللہ تعالیٰ نے چوپایوں کی شکل میں انسان کے لیے مہیا فرمایا ہے۔ اگر انسان غور کرے تو اس امر میں ذرا شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان چوپایوں سے جو گوناگوں فوائد حاصل کر رہا ہے یہ اس کو محض اتفاقی واقعہ کے طور پر نہیں حاصل ہو رہے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہی فوائد کے لیے ان چیزوں کو وجود بخشا اور ہر اعتبار سے ان کو ان کے فوائد کے لیے موزوں بنایا ہے۔ انسان کو سواری اور بار برداری کا محتاج بنایا تو سواری اور بار برداری کے لیے نہایت موزوں جانور پیدا کیے، اس کو دودھ اور گوشت اور

کھال اور اون کا ضرورتمند بنایا تو ان تمام ضروریات کے لیے الگ الگ نہایت مناسب چوپائے عطا کیے۔ یہ چیز اس بات کی صاف دلیل ہے کہ اس کائنات کا خالق نہایت مہربان ہے اور اس کی شکر گزاری واجب ہے۔ پھر اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ جب اس نے انسان کو اس اہتمام کے ساتھ اپنی نعمتوں سے نوازا ہے تو لازم ہے کہ ایک ایسا دن بھی آئے جس دن وہ ان نعمتوں کے متعلق لوگوں سے سوال کرے، جنھوں نے ان کا حق پہچانا ہو ان کو انعام دے اور جو ان کو پا کر خدا کو بھول بیٹھے ہوں ان کو اس کفرانِ نعمت کی سزا دے۔

ایمان لانے کے لیے اصل چیز یہ ہے کہ آدمی کے اندر ایمان کا ارادہ پایا جاتا ہو

'لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ' میں فعل 'يُوْقِنُوْنَ' ارادۂ فعل کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے یعنی مذکورہ چیزوں کے اندر توحید و معاد اور جزا و سزا کی دلیلیں تو بے شمار ہیں لیکن مجرد دلیلوں کا وجود اس کے لیے نافع نہیں ہے جس کے اندر دلیلوں کو قبول کرنے کا ارادہ نہ پایا جاتا ہو جو شخص کسی بات کا یقین نہیں کرنا چاہتا وہ بدیہی سے بدیہی حقیقت کے خلاف بھی کچھ نہ کچھ شکوک ایجاد کر ہی لیتا ہے۔

وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۵)

'اِخْتِلَافٌ' کے معنی یہاں یکے بعد دیگرے رات اور دن کی آمد و شد کے ہیں۔ ساتھ ہی یہ لفظ اس اختلافِ مزاج کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ کر رہا ہے جو رات اور دن کے اندر پایا جاتا ہے اور جو اس کائنات کی نشو و نما اور اس کی بہبود و بقا کے لیے ضروری ہے۔ 'مِنْ رِّزْقٍ' سے مراد یہاں پانی ہے جو ذریعۂ رزق بنتا ہے، گویا مسبّب سبب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ الفاظ کا یہ طریقۂ استعمال عربی بلکہ کم و بیش ہر زبان میں معروف ہے۔

رات اور دن کی آمد و شد کے اشارات

اختلاف لیل و نہار کی دلیل قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہوئی ہے کہ باوجودیکہ ان دونوں کے اندر نسبت ضدین کی ہے، ایک خشک ہے دوسرا گرم، ایک پُرسکون ہے دوسرا پُرشور، ایک تاریک ہے دوسرا روشن، تاہم ان کے اندر انسان کی پرورش کے لیے زوجین کی سی سازگاری اور موافقت پائی جاتی ہے۔ یہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ دونوں ایک ہی خدا کے بنائے ہوئے اور اسی کے حکم سے برابر، پوری پابندی وقت کے ساتھ، اپنے مفوضہ فرائض کی بجاآوری میں سرگرم ہیں۔ اگر یہ الگ الگ خداؤں کی ایجاد ہوتے تو ان کے اندر جو سازگاری پائی جاتی ہے اس کا وجود میں آنا ناممکن تھا اور اگر یہ سازگاری وجود میں نہ آتی تو اس کرۂ زمین کے باشندوں کے لیے زندگی ناممکن ہو جاتی۔

بارش کی نشانیاں

یہی حال بارش کا ہے کہ وہ ہوتی تو آسمان سے ہے لیکن زندگی زمین اور اہل زمین کو بخشتی ہے۔ یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ آسمانوں اور زمین کے اندر ایک ہی ارادہ کارفرما ہے۔ اگر آسمان کے دیوتا الگ اور زمین کے دیوتا الگ ہوتے تو آسمان کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین والوں کے لیے

غذا کا ذخیرہ اتارتے! پھر یہ بات بھی ہر موسم میں، ہر خاص و عام کے مشاہدہ میں آتی ہے کہ زمین بالکل خشک اور بے آب و گیاہ ہوتی ہے، اس کے کسی گوشے میں بھی زندگی کی کوئی نشانی دکھائی نہیں دیتی کہ بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی دیکھتے دیکھتے زمین کا ہر گوشہ لہلہا اٹھتا ہے۔ تو جس خدا کی یہ شانیں ہر موسم میں ہم دیکھتے ہیں اگر وہ اس دنیا کے مرکھپ جانے کے بعد اس کو دوبارہ زندہ کرنا چاہے تو کیا یہ کام اس کے لیے مشکل ہو جائے گا؟

ہواؤں کی گردش کی نشانیاں

'وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ' یعنی ہواؤں کی گردش میں بھی خدا کی قدرت، رحمت، ربوبیت اور اس کی نقمت کی نشانیاں موجود ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی مُتَصَرِّف کے ہاتھ میں ان کی باگ ہے اور وہی اپنی حکمتوں کے تحت ان کو استعمال کرتا ہے اگر وہ ان کو روک دے تو چشم زدن میں ساری دنیا تباہ ہو جائے۔ وہ چاہے تو ایک قوم کے لیے اس کو رحمت بنا دے اور دوسری قوم کے لیے نقمت۔ اسی ہوا کی گردش سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات بخشی اور اسی کی گردش سے فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کیا۔ آئے دن یہ بات مشاہدہ میں آتی رہتی ہے کہ کسان اپنی فصل کے مستقبل سے نہایت مطمئن ہوتے ہیں لیکن دفعۃً کوئی ایسی ہوا چل جاتی ہے کہ مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ ملاح اپنی کشتیوں کے بادبان کھولے ہوئے اور کسان اپنی گندم صاف کرنے کے آلات لیے ہوئے سازگار ہوا کے انتظار میں چشم براہ ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں کہ سازگار ہوا چلا دے۔ اس زمانے میں سائنس کی بدولت اگرچہ انسان کے اندر یہ زعم پیدا ہو گیا ہے کہ اس نے ابر و ہوا کو بہت بڑی حد تک اپنے قابو میں کر لیا ہے لیکن قدرت ذرا سا جھنجھوڑ دیتی ہے تو اس ادعا کا سارا بھرم کھل جاتا ہے۔ یہ باتیں اس بات کی صاف شہادت ہیں کہ ایک ہی ذات ہے جو اس کائنات کے تمام عناصر پر حکمران ہے۔ اس کے اذن کے بغیر ایک پتہ بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔

'اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ' یعنی نشانیاں تو قدم قدم پر توحید اور معاد کی موجود ہیں لیکن یہ نشانیاں نظر ان لوگوں کو آتی ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے یا کام لیتے ہیں تو بس اسی حد تک جس حد تک، وہ ان کی مادی ضروریات کی تکمیل میں ان کا ہاتھ بٹا سکے، وہ لوگ، ان نشانیوں کے اصل جمال کے مشاہدہ سے محروم ہی رہتے ہیں۔

یہاں قرآن نے ان نشانیوں کی طرف اجمالی اشارات کیے ہیں اس وجہ سے ہم بھی اجمالی اشارات ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ پچھلی سورتوں میں یہ باتیں تفصیل سے گزر چکی ہیں اور ہم بھی ان کی وضاحت پوری تفصیل سے کر چکے ہیں۔

تینوں آیات کا مجموعی نتیجہ

اوپر کی تینوں آیات سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اہل ایمان کے لیے تو اس کائنات کا گوشہ گوشہ

توحید و معاد کی نشانیوں سے معمور ہے۔ رہے دوسرے تو ان سے بھی یہ نشانیاں مخفی نہیں ہیں بشرطیکہ ان کے اندر ماننے اور یقین کرنے کا حوصلہ اور اپنی عقل سے صحیح کام لینے کا دم داعیہ ہو۔ جو لوگ ایک حقیقت کو، خواہ وہ کتنی ہی واضح ہو، ماننا ہی نہیں چاہتے یا اپنی عقل سے وہ اصل کام لیتے ہی نہیں جس کے لیے وہ فی الحقیقت خلق ہوئی ہے، ایسے لوگوں کے اندھے پن کا کوئی علاج نہیں ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (۶)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور آپ کے مخالفین کو ملامت ہے۔ 'تِلْكَ' کا اشارہ آفاق و انفس کی انہی نشانیوں کی طرف ہے جو اوپر کی آیات میں مذکور ہوئیں۔ فرمایا کہ اللہ کی توحید، اس کی قدرت و حکمت اور اس کے روز جزا و سزا کی یہ نشانیاں ہیں جو اس قرآن کے ذریعہ سے ہم تم کو، ان کے صحیح نتائج و لوازم کے ساتھ، پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ یہ نشانیاں اس قدر واضح ہیں کہ کوئی ذی ہوش ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ انہی کے واقعی نتائج و لوازم کو قرآن تسلیم کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ اگر تمھارے یہ مخالفین ان نشانیوں کے بدیہی نتائج کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں تو اب، ان سے زیادہ عقل اور دل کو مطمئن کرنے والی اور کون سی چیز ہو سکتی ہے جس پر ایمان لائیں گے!

آنحضرت صلعم کے لیے تسلی اور مخالفین کو ملامت

'نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ' میں 'بِالْحَقِّ' سے مراد وہ قطعی اور حقیقی نتائج ہیں جو ان نشانیوں پر غور کرنے سے سامنے آتے ہیں۔ یہ قید اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جہاں تک ان نشانیوں پر غور کرنے کا تعلق ہے ان پر غور تو دوسرے بھی کرتے ہیں لیکن وہ اپنے مخصوص اور نہایت محدود زاویہ سے غور کرتے ہیں اس وجہ سے یا تو ان حقائق تک پہنچ نہیں پاتے جو ان کے اندر مضمر ہیں یا پہنچتے تو ہیں لیکن چونکہ وہ ان کے نفس کی خواہشوں کے خلاف ہیں اس وجہ سے ان کے اعتراف سے گریز کرتے ہیں۔ مثلاً آسمان و زمین کی نشانیوں پر فلکیات و ارضیات کے ماہرین بھی غور کرتے ہیں۔ انسان کی خلقت پر اناٹومی (ANATOMY) والے بھی تحقیق کرتے ہیں، حیوانات کے مختلف پہلوؤں پر علم الحیوانات والے بھی سر کھپاتے ہیں، رات اور دن کی گردش، بارشوں کے اوقات، واترات اور ہواؤں کے تغیر و تبدل پر موسمیات والے بھی بہت کچھ ہوا باندھتے ہیں لیکن ان سب کا حال ان کی تنگ نظری کے سبب سے یہ ہے کہ یہ اپنی دوربینوں اور خوردبینوں سے تل کو تو دیکھ لیتے ہیں لیکن تل کے اوٹ کا پہاڑ ان کو نظر نہیں آتا۔ موسمیات والے یہ پیشینگوئی تو کر دیں گے کہ آگے چوبیس گھنٹے موسم گرم و خشک رہے گا اور اس کی کوئی الٹی سیدھی توجیہ بھی کر دیں گے۔ اکثر حالات میں ان کی پیشین گوئی صحیح بھی ثابت ہوتی ہے اور بعض حالات میں ان کی پیش کردہ توجیہ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی نگاہ صرف ہواؤں کے تصرف کی نوعیت اور اس کے اثرات کا اندازہ کرنے تک محدود رہ جاتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ اس سوال پر

'بالحق' کا مفہوم

غور کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے کہ ان تصرفات کے پس پردہ حقیقی مُتَصَرِّف کون ہے اور اس کے حقوق و فرائض کیا ہیں! حالانکہ کائنات کے اندر یہ تمام تصرفات و تغیرات جو ہوتے ہیں یہ اسی لیے ہوتے ہیں کہ انسان اس اصل سوال تک پہنچے، اس کا حل دریافت کرے اور اگر خدا کا کوئی بندہ اس کو اس سوال کا کوئی دلنشین حل بتائے تو اس کو قبول اور اس پر عمل کرے۔ قرآن نے ان نشانیوں کے انہی پہلوؤں کو خاص طور پر بے نقاب کیا ہے جو اصل حقیقت پر روشنی ڈالنے والے ہیں اس وجہ سے اس کو نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ سے تعبیر فرمایا ہے۔

دو اہم حقیقتیں

اس سے ایک بڑی اہم حقیقت یہ واضح ہوئی کہ قرآن کی دعوت جبر یا تحکم پر مبنی نہیں ہے بلکہ تمام تر آفاق و انفس کے واضح دلائل اور عقل و فطرت کے بیّنات پر مبنی ہے۔ جو لوگ ان کو نہیں مانتے ان کے نہ ماننے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ مخفی ہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ ان کو اپنے نفس کی خواہشوں کے خلاف پاتے ہیں اس وجہ سے ان سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں ظاہر ہے کہ وہ کوئی بھی ایسی بات ماننے کو تیار نہیں ہو سکتے جو ان کی خواہش کے خلاف ہے اگرچہ وہ سورج سے بھی زیادہ روشن ہو کر ان کے سامنے آئے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ اس کائنات میں سب سے زیادہ بدیہی بلکہ ابدہ البدیہیات اللہ اور اس کی نشانیاں ہیں۔ جو لوگ ان کے منکر ہیں وہ کسی بھی حقیقت کو ماننے کے اہل نہیں ہیں۔ وہ محض اپنی خواہشوں کے غلام، اپنے پیٹ اور تن کے پجاری ہیں۔ اس طرح کے لوگ اگر کچھ نئی نشانیوں اور معجزات کا مطالبہ کریں تو ان کے مطالبات لائق توجہ نہیں ہیں۔ اس طرح کے اندھوں کی آنکھیں کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی نہیں کھول سکتا۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۙ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۷-۸)

یہ اسی ملامت کے مضمون کی مزید توسیع ہے کہ جن لوگوں نے اس طرح تمام حقائق تلپٹ کر دیے ہیں تاکہ اپنی گنہگارانہ زندگی کے لیے سندِ جواز فراہم کریں ان کے لیے ہلاکی ہے۔

'اَفَّاكٌ' لو 'اَثِيْم'

'اَفَّاكٌ' کے معنی ہیں حقائق کی قلب ماہیت کر دینے والا، یعنی خدا کی نشانیاں اور اس کی آیات تو کسی اور حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہوں لیکن وہ محض اپنی خواہشاتِ نفس کی بندگی میں اس حقیقت کی بالکل قلب ماہیت کر دے۔ اس کے مصداقِ اول تو قریش کے مشرکین تھے جنھوں نے محض اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی میں دین ابراہیم کو مسخ کیا لیکن اس کے عام مصداق میں ہر دور کے وہ محرّفینِ دین شامل ہیں جو اللہ کی آیات اور اس کے احکام میں اپنی خواہشات کے تحت تحریف کے مرتکب ہوئے یا ہو رہے ہیں۔

'اَثِیْمٌ' کے معنی گنہگار، خاص طور پر حقوق و فرائض کے تلف کرنے والے کے ہیں۔ 'اَفَّاکٍ' کے ساتھ اس صفت کا جوڑ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ حقائق کے تلبیس، ماہیت کی اس سازش کے مرتکب وہی نابکار ہوتے ہیں جو خدا کے حقوق و فرائض کے ادا کرنے سے گریز اور اپنی معصیت کی زندگی پر اصرار کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا کہ ان بدبختوں کے لیے ہلاکی اور تباہی ہے اس لیے کہ اللہ کی آیات ان کو سنائی جا رہی ہیں لیکن یہ نہایت تکبر کے ساتھ ان کو سن کر اس طرح چل دیتے ہیں گویا کوئی بات انھوں نے سنی ہی نہیں۔ یہ اشارہ قریش کے لیڈروں کے اس رویے کی طرف ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے جواب میں اختیار کرتے۔ اوّل تو یہ لوگ مجلس نبوی میں جانے ہی کو عار خیال کرتے لیکن کبھی پہنچ بھی جاتے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے پاس جا کر ان کو قرآن سناتے تو اس طرح کان جھاڑ کر اٹھ جاتے گویا کوئی بات انھوں نے سنی ہی نہیں۔

'تُتْلٰی عَلَیْہِ' کے الفاظ سے ان کے جرم کی سنگینی کا اظہار ہو رہا ہے کہ اگر دعوت حق کسی کو پہنچی نہ ہو اور وہ اس سے غافل رہ جائے تو اس کے لیے کچھ عذر ہو سکتا ہے لیکن وہ بدبخت خدا کو کیا جواب دے گا جس کے کانوں میں رسول نے خود جا کر اذان دی لیکن وہ بیدار نہ ہوا!

اصرار علی الشرک کا اصل سبب استکبار ہے

'یُصِرُّ مُسْتَکْبِرًا' میں اصرار علی الشرک کے اصل سبب پر روشنی پڑتی ہے کہ ان کے اصرار کی اصل علت یہ نہیں ہے کہ ان پر حقیقت واضح نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ اس بات میں اپنی سبکی سمجھتے ہیں کہ قوم کے سردار اور اعیان و اشراف ہو کر ایک ایسے شخص کی بالاتری اپنے اوپر تسلیم کر لیں جو دنیوی وجاہت میں ان کا ہمسر نہیں ہے۔

'فَبَشِّرْہُ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ' یہ اس 'وَیْلٌ' کی وضاحت ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا کہ اس طرح کے تمام متکبرین کو ایک دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔ یہ لوگ اگر اپنے غرور کے باعث نجات کی بشارت سے اپنے کان بند کیے ہوئے ہیں تو بند رکھیں، عذاب کی خوش خبری بہرحال ان کو پہنچا دو جو اس طرح کے لوگوں کے لیے لازمی ہے۔

وَإِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ (۹)

حق کی مخالفت کا عامیانہ حربہ

اوپر کی آیت میں متکبرین کا وہ رویہ بیان ہوا ہے جو وہ اس وقت اختیار کرتے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود ان کو قرآن سنانے کی کوشش فرماتے۔ اب ان کا وہ رویہ بیان ہو رہا ہے جو اس وقت وہ اختیار کرتے جب قرآن کی کوئی بات ان کو کسی اور واسطہ سے پہنچتی۔ فرمایا کہ ان کو ہماری آیات میں سے کسی چیز کا علم ہوتا ہے تو اس کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دوسرے ان سے متاثر نہ ہونے پائیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں قریش

کے اندر ایسے لوگ بھی تھے جو غیر جانبدارانہ ذہن کے ساتھ قرآن کی آیتیں سنتے اور ان سے وہ متاثر بھی ہوتے۔ اس طرح کے لوگ ان آیتوں کو اپنے سردار دوں کے علم میں بھی لانے کی کوشش کرتے تاکہ ان کے باب میں ان کی رائے معلوم کریں۔ ان کے سردار فوراً تاڑ جاتے کہ لوگ ان آیات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اس اثر سے لوگوں کو بچانے کے لیے وہ یہ تو کر نہیں سکتے تھے کہ دلیل سے قائل کر دیں کہ قرآن کی بات میں فلاں چیز عقل یا فطرت یا حقیقت کے خلاف ہے۔ واحد تدبیر جو وہ کر سکتے تھے وہ یہی تھی کہ قرآن کی بات کا مذاق اڑائیں تاکہ اس طرح بات ہوا میں اڑ جائے اور کسی پر اس کا کوئی اثر نہ ہونے پائے۔ اس قسم کی عامیانہ حرکت، اگرچہ کچھ زیادہ کارگر نہیں ہوتی تاہم وقتی طور پر کمزور رائے کے لوگ، غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ حربہ ہر دور کے شیاطین نے حق کے خلاف استعمال کیا ہے۔

سب سے زیادہ سخت عذاب وہ ہے جس کے ساتھ رسوائی ہو

'اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ'۔ ان لوگوں کے اس رویہ کا اصل محرک، جیسا کہ اوپر والی آیت میں مذکور ہوا، استکبار تھا اس وجہ سے فرمایا کہ ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ انھوں نے حق کے مقابل میں گھمنڈ کیا اس وجہ سے ان کے لیے آخرت میں رسوائی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اگرچہ اللہ کا ہر عذاب پناہ مانگنے کی چیز ہے لیکن اس کا سب سے زیادہ سخت عذاب وہ ہے جس کے ساتھ رسوائی بھی ہو۔ یہ عذاب، مستکبرین کے لیے خاص ہے۔

مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـًٔا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۰)

'مِنْ وَّرَآئِهِمْ' کا مفہوم ہمارے اردو کے 'ورے' اور 'پرے' کی طرح موقع و محل سے معیّن ہوتا ہے۔ اس کا مطلب آگے بھی ہو سکتا ہے اور پیچھے بھی۔ فرمایا کہ ان لوگوں کے لیے آگے جہنّم ہے جس میں یہ پڑیں گے اور اس میں پڑنے کے بعد نہ ان کا وہ حرام اندوختہ ان کے کچھ کام آئے گا جو ان کے استکبار اور حق سے اعراض کا سبب بنا اور نہ ان کے وہ مزعومہ شرکاء و شفعاء ہی کچھ کام آئیں گے جن کو انھوں نے اللہ کے سوا اپنا کارساز بنایا۔

'وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ'۔ اور عذاب بھی کوئی ایسا ویسا نہیں ہوگا جو کسی طرح جھیلا جا سکے بلکہ بہت بڑا عذاب ہوگا۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ آج نہیں ہو سکتا۔

هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ (۱۱)

یعنی یہ قرآن اللہ کی نازل کردہ ہدایت ہے۔ یہ ہنسی مسخری کی چیز نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ کی ان آیات کا انکار کریں گے یا مذاق اڑائیں گے وہ یاد رکھیں کہ ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہوگا۔ 'مِنْ رِّجْزٍ' کے الفاظ اس عذاب کی نوعیت واضح کر رہے ہیں۔ 'رجز' اس سزا یا عذاب کو کہتے ہیں جو کپکپی پیدا کر دے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی معمولی عذاب نہیں ہوگا بلکہ نہایت دردناک ہوگا جو دلوں کو

لرزا دے گا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۲-۱۳)

**دلائل کا سلسلۂ بیان**

اوپر کی چار آیتیں توحید اور معاد کے دلائل کے بیچ میں بطور تنبیہ و تذکیر آ گئی تھیں تاکہ قریش کے لیڈروں کو برسرِ موقع تنبیہ ہو جائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دے دی جائے۔ اب اس آیت میں اصل سلسلۂ کلام کو پھر لے لیا۔ فرمایا کہ اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو اس طرح تمھاری خدمت میں لگا رکھا ہے کہ وہ اپنے سینہ پر تمھاری کشتیوں کو چلاتا ہے۔ 'بِاَمْرِهٖ' یعنی یہ بات خاص خدا کے حکم سے ہوتی ہے۔ اگر خدا کا حکم نہ ہوتا تو دیکھتے ہو کہ کشتی سے کہیں زیادہ چھوٹی چیزیں سمندر کے اندر ڈالتے ہی ڈوب جاتی ہیں لیکن ہزاروں ٹن کا جہاز اس پر تیرتا ہے۔ یہ اللہ ہی کا بنایا ہوا قانون ہے کہ لوہے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تو ڈوب جائے لیکن جہاز اپنے اوپر ہزاروں ٹن لوہا لادے ہوئے نہ ڈوبے۔ 'وَلِتَبْتَغُوْا' سے پہلے قرینہ دلیل ہے کہ 'لِتَرْكَبُوْا' یا 'لِتُسَافِرُوْا' یا ان کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ حرف عطف اس حذف کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمھارے لیے یہ اہتمام اس لیے فرمایا ہے کہ تم ایک مقام سے دوسرے مقام کا سفر کرو اور تجارت کی راہ سے اس کے فضل کے طالب بن سکو۔

**مشاہداتِ ربوبیت کی اصل تعلیم**

'وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ' یہ وہ اصل سبق ہے جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے ان مشاہدات سے ہر اس شخص کو ملتا ہے جس کے ضمیر اور جس کی عقل کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی ہے۔ فرمایا کہ اللہ نے اپنی پروردگاری کی یہ شانیں اس لیے تم کو دکھائی ہیں کہ تم اس کے شکرگزار بندے بنو۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ شکرگزاری کا یہ جذبہ ہی خدا کی بندگی کی اصل ہے۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔

'وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ' اوپر خاص طور پر سمندر کی تسخیر کا ذکر فرمایا تھا جو انسان کے مشاہدہ میں آنے والی چیزوں میں سب سے زیادہ زوردار اور بظاہر بالکل ناقابلِ تسخیر بھی ہے اور کم و بیش ہر شخص کو اس کے سفر کا تجربہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ اب یہ خاص کے بعد اس کائنات کی عام چیزوں کا حوالہ دیا کہ اسی خدا نے آسمانوں اور زمین کی دوسری چیزوں کو بھی تمھاری منفعت رسانی میں لگا رکھا ہے۔ 'جَمِيْعًا مِّنْهُ' یعنی یہ ساری چیزیں اسی کے حکم سے بالواسطہ یا بلا واسطہ تمھاری خدمت انجام دے رہی ہیں۔ 'جَمِيْعًا' کا تعلق ماسبق سے نہیں بلکہ 'مِنْهُ' سے ہے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی نہ تم نے مسخر کیا ہے، نہ کسی اور نے مسخر کیا ہے اور نہ یہ چیزیں بطور خود تمھاری چاکری کر رہی ہیں بلکہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے تمھارے رب کی تدبیر سے ہو رہا ہے اس لیے کہ تنہا وہی ہے جو ان تمام چیزوں کا خالق اور ان پر متصرف ہے۔

'اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ'۔ یعنی غور کرنے والوں کے لیے آفاق کی نشانیوں

ہیں توحید اور معاد کی گوناگوں دلیلیں موجود ہیں۔

آفاق کی نشانیوں میں توحید اور معاد کی دلیلیں

— ان کا مسخر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی یہ درجہ نہیں رکھتی کہ اس کو معبود مان کر اس کی پرستش کی جائے بلکہ ہر چیز اپنے وجود سے اس بات کی شاہد ہے کہ اس کی نکیل ایک بالاتر قوت، کے ہاتھ میں ہے جو اس کو اپنی مشیت اور حکمت کے تحت استعمال کر رہی ہے۔

— ان کے اندر تضاد و تخالف کے باوجود اس طرح کی موافقت اور سازگاری بھی ہے جو ایک مشین کے پرزوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ یہ توافق اس بات کی دلیل ہے کہ ایک ہی ارادہ ہے جو اس کائنات کے پورے نظام پر حاوی ہے۔

— اس نظام میں ربوبیت، رحمت اور حکمت کی ایسی شہادتیں موجود ہیں جو اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہیں کہ کوئی اندھی بہری قوت اس کو نہیں چلا رہی ہے۔ اس کا علم، اس کی رحمت اور اس کی حکمت، مقتضی ہے کہ وہ ایک ایسا روز جزاء و سزا بھی لائے جس میں وہ ان لوگوں کو انعام دے جنھوں نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس کی نعمتوں کی ناقدری کی اور کفر و شرک میں مبتلا ہوئے اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ یا تو نعوذ باللہ، بالکل بے اختیار ہے یا بالکل بے حس اور کھلنڈرا۔ یہ باتیں اس کی اعلیٰ صفات کے منافی ہیں۔

دلائل کی کمی نہیں ہے ضرورت تفکر کی ہے

آخر میں لفظ 'یَتَفَکَّرُوْنَ' اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ جہاں تک دلائل کا تعلق ہے ان کی کمی نہیں ہے۔ کائنات کا چپہ چپہ ان سے معمور ہے اور قرآن نے بھی ان کی پوری تفصیل کر دی ہے۔ کمی جس چیز کی ہے وہ تفکر کی ہے۔ لوگ اللہ کی نشانیوں پر غور نہیں کرتے اور یہ غور کرنا انسان کا اپنا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر کسی کو مجبور نہیں کرتا۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰهِ لِیَجْزِیَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ (۱۴)

'یَغْفِرُوْا' یہاں درگزر اور نظر انداز کرنے کے معنی میں ہے۔

'اَیَّامَ اللّٰهِ' سے مراد اللہ تعالیٰ کے عدل و انتقام کے وہ تاریخی دن ہیں جس میں اس نے رسولوں کے مکذبین کو صفحۂ ارض سے نیست و نابود کیا ہے۔ قرآن میں قوموں کی جو تاریخ بیان ہوئی ہے۔ اس میں ان 'ایام' کا ذکر گزر چکا ہے اور آگے بھی ان کی تفصیل آئے گی۔ 'لِیَجْزِیَ قَوْمًا' میں 'قوم' سے مراد یہی مخالفین ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ اس لفظ کی تنکیر اظہار نفرت و بیزاری کے لیے ہے جس طرح 'اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا' میں لفظ 'قُلُوْبٍ' کی تنکیر ہے جن لوگوں نے اس سے مسلمانوں کو مراد لیا ہے انھوں نے سیاق و سباق کی دلالت اور اسلوب کی بلاغت پر غور نہیں کیا۔

مسلمانوں کے لیے تسلی

جس طرح اوپر آیت ۹ میں مخالفین کی ضد اور ہٹ دھرمی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی

ہے اسی طرح اس آیت میں اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ مخالفین کی اوچھی حرکتوں سے وہ دل برداشتہ نہ ہوں بلکہ ان کو ابھی نظر انداز کریں۔ ان لوگوں کو چونکہ یہ اندیشہ نہیں ہے کہ جس روز بد سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے وہ فی الواقع ظہور میں بھی آنے والا ہے اس وجہ سے یہ دلیر ہوتے جا رہے ہیں لیکن اللہ اس قابل نفرت قوم کو اس لیے ڈھیل دے رہا ہے کہ یہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں تاکہ یہ اپنے کیے کی بھرپور سزا پائیں۔ سنت الٰہی یہی ہے کہ وہ شریروں کو پوری مہلت دیتا ہے تاکہ ان پر اللہ کی حجت پوری ہو جائے اور جب وہ پکڑے جائیں تو ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ (۱۵)

یہ اسی تسلی کے مضمون کی مزید وضاحت ہے کہ اگر یہ لوگ نیکی کی راہ اختیار کریں گے تو اس کا نفع انہی کو پہنچے گا اور اگر بدی پر جمے رہ گئے تو اس کا وبال انہی پر آئے گا۔ اس کی کوئی ذمہ داری اہل ایمان پر نہیں ہو گی جب کہ انھوں نے حق لوگوں کو پہنچا دیا۔ پھر قیامت کے دن سب کی پیشی خدا کے سامنے ہو گی اور اس دن فیصلہ ہو جائے گا کہ کون حق پر رہا اور کون باطل پر اور کون کس انجام کا سزاوار ہے۔

## ۲ - آگے کا مضمون —— آیات ۱۶ - ۲۳

آگے یہود کے اس رویہ سے بحث ہے جو اسلام دشمنی کے جوش میں، مشرکین کی حمایت میں انھوں نے اختیار کیا۔ اس دور میں، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں انھوں نے بھی کھلم کھلا مشرکین کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی تھی۔ ان کو چونکہ ایک مذہبی گروہ کی حیثیت حاصل رہی تھی اس وجہ سے ان کی شہ نے مشرکین کا حوصلہ بہت بڑھا دیا تھا۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ ان کا پول کھول دیا جائے تاکہ مسلمانوں کے اندر ان کی مخالفت سے کوئی ہراس نہ پیدا ہو اور مشرکین بھی آگاہ ہو جائیں کہ جن کی شہ پر وہ بہت نازاں ہیں وہ ان سے بھی بڑے خدا کے مجرم ہیں۔ اگر ان کے کہے پر وہ چلے تو بالآخر دونوں کا انجام ایک ہی ہو گا۔ اسی ضمن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے استقلال کے ساتھ اپنے موقف حق پر ڈٹے رہنے کی تاکید فرمائی گئی کہ اب خدا کی اصل شریعت پر تم ہی ہو۔ نہ تمھیں یہود کی پروا کرنی ہے نہ مشرکین کی۔ اللہ کی تائید صرف تمھیں اور تمھارے ساتھیوں ہی کو حاصل ہے اور اللہ کی تائید بس ہے —— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ

آیات ۱۶-۲۳

وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ
بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ
الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١٧﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰي شَرِيْعَةٍ
مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٨﴾
اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ
اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٩﴾ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ لِلنَّاسِ
وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿٢٠﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ
اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَاۗءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَاۗءَ مَا
يَحْكُمُوْنَ ﴿٢١﴾ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ ع ١٨
لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٢﴾ اَفَرَءَيْتَ
مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰي عِلْمٍ وَّخَتَمَ
عَلٰي سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰي بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۭ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ
مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٣﴾

ترجمہ آیات ۱۶-۲۳

اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت اور نبوت سے سرفراز کیا اور ان کو پاکیزہ رزق عطا کیا اور دنیا والوں پر ان کو فضیلت بخشی اور ان کو شریعتِ الٰہی کے کھلے کھلے احکام دیے۔ تو انھوں نے نہیں اختلاف کیا مگر بعد

اس کے کہ ان کے پاس علم آچکا تھا، محض باہمی ضدّم ضدّا کے سبب سے۔ بیشک تیرا رب ان کے درمیان فیصلہ کرے گا قیامت کے دن ان تمام چیزوں کے بارے میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ پھر ہم نے تم کو اللہ کی ایک واضح شریعت پر قائم کیا تو تم اسی کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ یہ لوگ خدا کے آگے تمھارے کچھ کام آنے والے نہ بنیں گے اور اپنی جانوں پر یہ ظلم ڈھانے والے ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور اللہ اپنے ڈرنے والے بندوں کا کارساز ہے۔ ۱۶-۱۹

یہ لوگوں کے لیے بصیرت پیدا کرنے والی آیات کا مجموعہ اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین کریں۔ کیا وہ لوگ جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے، سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کی مانند کر دیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کی زندگی اور موت یکساں ہو جائے گی؟ بہت ہی بُرا فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں! اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور تاکہ بدلہ دیا جائے ہر جان کو اس کے کیے کا اور ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو گی۔ ۲۰-۲۲

کیا دیکھا تم نے اس کو جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور اس کو جس کو اللہ نے علم رکھتے ہوئے گمراہ کر دیا اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر کر دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا! بھلا ایسوں کو کون ہدایت دے سکتا ہے بعد اس کے کہ اللہ نے ان کو گمراہ کر دیا ہو! کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے! ۲۳

# ۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰھُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۱۶)

انعامات جو اللہ نے بنی اسرائیل پر کیے لیکن انھوں نے ان کی ناقدری کی

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر جو عظیم احسانات فرمائے یہ ان کا حوالہ ہے اور مقصود ان کے حوالہ سے، جیسا کہ ہم نے پیچھے اشارہ کیا اور آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا، یہ دکھانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر بڑے بڑے احسانات کیے لیکن یہ قوم ایسی ناہنجار نکلی کہ اس نے ہر احسان کی ناقدری کی یہاں تک کہ خود بھی اللہ کی نعمتوں سے محروم ہوئی اور اپنی ہی طرح دوسروں کو بھی اس سے محروم ہی دیکھنا چاہتی ہے۔

'اَلْکِتٰبَ' سے مراد ظاہر ہے کہ تورات ہے۔

'حُکْمَ' سے یہاں قرینہ دلیل ہے کہ وہ حکومت مراد ہے جو بنی اسرائیل کو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے دور میں حاصل ہوئی اور ایک طویل مدت تک قائم رہی۔ کتاب اور حکومت میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ اللہ کی کتاب اس کے احکام و قوانین کا مجموعہ ہوتی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ جس قوم کو اپنے احکام و قوانین کا صحیفہ عطا فرماتا ہے اس کو لازماً حکومت بھی دیتا ہے اس لیے کہ احکام و قوانین کی تنفیذ کے لیے حکومت ناگزیر ہے۔ اس حکومت سے قوم اسی وقت محروم ہوتی ہے جب وہ اللہ کے احکام کو پیٹھ پیچھے پھینک دیتی ہے۔

'نبوۃ' کا مفہوم واضح ہے لیکن یہاں اس کے ذکر کا ایک خاص پہلو ہے وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے اندر نبوت کا ایک ایسا سلسلہ اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا جو حضرت مسیح علیہ السلام تک بلا انقطاع جاری رہا۔ حضرت مسیحؑ کے ساتھ اس قوم نے جو سلوک کیا اس کے نتیجہ میں یہ قوم ملعون ہوئی پھر حکومت اور نبوت دونوں نعمتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔

'وَرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ' سے رزق و فضل اور نعمت و رفاہیت کی اس فراوانی کی طرف اشارہ ہے جس کا آغاز ارض فلسطین پر ان کے قبضہ کے بعد سے ہوا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں یہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔

'وَفَضَّلْنٰھُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ' یہ فضیلت کسی قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب دیے جانے کا لازمی نتیجہ ہے۔ کتاب الٰہی خلق کے لیے ہدایت کی روشنی ہوتی ہے۔ یہ روشنی جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو پکڑاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس نے اس قوم کو اپنی خلق کی رہنمائی کے لیے چن لیا۔ بلاشبہ یہ ایک عظیم فضیلت ہے لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ یہ فضیلت مشروط ہے۔ جب تک

کوئی قوم خلق کی رہنمائی کا یہ فرض انجام دیتی ہے اس وقت تک اس کو یہ فضیلت حاصل رہتی ہے۔ جب وہ اس فرض کو ترک کر دیتی ہے اس فضیلت سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۱۷)

یہود کی رہنمائی کے لیے مزید اہتمام اور ان کی طرف سے اس کی ناقدری

'امر' سے مراد یہاں دین و شریعت ہے۔ فرمایا کہ مزید برآں ہم نے یہ کیا کہ شریعت کے احکام ان کو نہایت واضح قطعی اور غیر مشتبہ شکل میں دیے تاکہ ان میں کسی اختلاف یا ان سے فرار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ لیکن اس سارے اہتمام کے باوجود انھوں نے اختلاف کیا اور یہ اختلاف اس وجہ سے نہیں کیا کہ اس کے لیے کوئی وجہ موجود تھی بلکہ علمِ وحی کی روشنی موجود ہوتے ہوئے انھوں نے محض ضدم ضدا کے باعث یہ اختلاف برپا کیا جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ وہ اللہ کی روشنی سے محروم ہو بیٹھے۔ اب قیامت کے دن اللہ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا کہ یہ کس حد تک حق بجانب تھے اور کس حد تک اس میں محض ان کی ضد، ہٹ دھرمی، بات کی پچ اور حریف کو شکست دینے کی خواہش کو دخل رہا ہے۔

مسلمانوں کو تسلی اور قریش کو تنبیہ

یہاں ان کے کردار کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود ایک طرف تو مسلمانوں کو تسلی دینا ہے کہ آج جو لوگ پنچ بن کر یہ فیصلہ کرنے اٹھے ہیں کہ قریش حق پر ہیں یا مسلمان، ان کا اپنا حال یہ ہے کہ آپس کے اختلافات اور باہمی عناد و حسد کے سبب سے اللہ کے دین سے محروم ہو چکے ہیں۔ ایسے محروم القسمت لوگ اگر تمھارے حسد میں مبتلا ہو کر تمھاری مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

دوسری طرف قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ جو لوگ خود اپنی آنکھوں میں دھول جھونک کر اندھے بن چکے ہیں ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ وہ تمھارے لیے سرمۂ بصیرت لے کر آئیں گے۔ وہ تو یہی چاہیں گے کہ جس طرح وہ اللہ کی روشنی گل کر کے اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں اسی طرح تم بھی، اس روشنی سے محروم، اسی اندھیرے میں بھٹکتے رہو جس میں اب تک بھٹکتے رہے ہو۔

اس آیت سے ایک نہایت اہم حقیقت یہ واضح ہوئی کہ دین کی کسی بات کے سمجھنے میں اختلافِ رائے ہونا نہ کوئی تعجب کی بات ہے اور نہ یہ دین اور اہلِ دین کے لیے کوئی نقصان دہ چیز ہے۔ اہلِ علم میں اس طرح کا اختلاف ہوا ہے اور ہو سکتا ہے لیکن اس اختلاف کی محرک، اگر باہمی چشمک و رقابت اور ایک دوسرے کو زک پہنچانے اور پچھاڑنے کی خواہش ہو تو یہ چیز بلاشبہ سارے دین کا تیا پانچا کر کے رکھ دیتی ہے۔ اسی نوعیت کے اختلاف نے اہلِ کتاب کو اللہ کی روشنی سے محروم کیا اور اسی قسم کے اختلافات نے مسلمانوں کو تباہی میں ڈالا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۸)

نبی صلعم کو اللہ کے اصل دین پر جمے رہنے کی تاکید

'شریعۃ' کے معنی صاف راستہ اور واضح طریقہ کے ہیں۔ اور 'مِنَ الْاَمْرِ' جس مفہوم میں اوپر والی آیت میں استعمال ہوا ہے اسی مفہوم میں اس آیت میں بھی استعمال ہوا ہے۔ فرمایا کہ جب ان اہل کتاب نے اللہ کی بتائی ہوئی صراط مستقیم گم کر دی اور خلق کو صحیح راہ بتانے والا کوئی نہیں رہا تب اللہ نے تم کو اپنی ایک واضح شریعت پر مبعوث فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آج بنی اسرائیل تمھاری دعوت کے خلاف یہ وسوسہ اندازی کرتے پھرتے ہیں کہ ان کے اور ان کی شریعت کے ہوتے کسی نئی کتاب اور نئی شریعت کی کیا ضرورت تھی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نظر اپنی کرتوتوں پر نہیں ہے۔ اگر ان کی نظر اپنی کرتوتوں پر ہوتی تو وہ جان جاتے کہ تمھاری بعثت اور اس کے کن تقاضوں اور خلق کی کس ضرورت کی تکمیل کے لیے ہوئی ہے۔ یہ مضمون 'حٰمٓ السجدۃ' کی آیت ۴۵ میں بھی گزر چکا ہے۔

'فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ'۔ 'اَهْوَآءَ' سے مراد، جیسا کہ اس کتاب میں جگہ جگہ ہم واضح کرتے آرہے ہیں، بدعات ہیں۔ بدعات کی ایجاد چونکہ اپنی خواہشوں ہی کو دین کی سند دینے کے لیے لوگ کرتے ہیں اس وجہ سے قرآن نے ان کو 'اَهْوَاء' سے تعبیر کر کے ان کے اصل منبع کا پتہ دے دیا کہ وہ دین یا عقل سے نہیں وجود میں آتی ہیں بلکہ ان کو نفس کی خواہشیں جنم دیتی ہیں۔

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکید ہے کہ تم کو اللہ نے جو واضح شریعت، تمام بدعات و خرافات سے پاک کر کے دی ہے اسی کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی بدعات کی پیروی نہ کرو جو نہیں جانتے ہیں۔ ان نہیں جاننے والوں میں، مشرکین اور یہود و نصاریٰ سب شامل ہیں۔ مشرکین عرب تو ظاہر ہے کہ کتاب و شریعت سے بالکل ناآشنا امی تھے۔ وہ دین ابراہیمی کے وارث ہونے کے مدعی ضرور تھے لیکن ان کے حصہ میں صرف وہ بدعات آئی تھیں جو ان کے جاہل باپ دادا نے دین ابراہیم (علیہ السلام) کے نام سے گھڑ رکھی تھیں۔ انہی کی حمایت میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑتے کہ آپ اپنی دعوت سے ان کے آبائی دین کو مٹا رہے ہیں۔ یہود اور نصاریٰ اگرچہ حامل کتاب ہونے کے مدعی تھے لیکن، جیسا کہ اوپر والی آیت میں بیان ہوا ہے، انھوں نے اللہ کے دین میں اتنے اختلافات پیدا کر لیے تھے کہ اصل حقیقت بالکل گم ہو گئی تھی۔ قرآن نے جب اصل حقائق واضح کیے اور وہ ان کی بدعات (اھواء) کے خلاف پڑے تو ان کے اندر بھی آگ لگ گئی کہ اس نئی دعوت سے تو ان کی دینداری کا سارا کاروبار معرض خطر میں ہے۔ حالانکہ قرآن کی دعوت سے نہ صرف انبیاء کا اصل دین نکھر کر سامنے آرہا تھا بلکہ اس کی تکمیل بھی ہو رہی تھی لیکن یہود و نصاریٰ چونکہ اصل دین سے بالکل تاریکی میں تھے اس وجہ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے بجائے قریش کے ساتھی بن کر اسلام کو مٹانے کے درپے ہو گئے۔

قرآن نے اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکید فرمائی کہ اللہ کی اصل شریعت پر تمہی ہو۔ یہ مخالفین خواہ کتنا ہی زور لگائیں لیکن تم اسی پر جمے رہو اور ان لوگوں کی بدعتوں کی پیروی ہرگز نہ کرنا جو اللہ کے اصل دین سے بے خبر ہیں۔

اس تاکید کی ضرورت اس وجہ سے نہیں پیدا ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خدانخواستہ یہ اندیشہ تھا کہ آپ ان کی بدعات کی طرف مائل ہو جائیں گے بلکہ لوگوں کی بدعات سے یہ بالواسطہ اظہارِ نفرت کا ایک طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو مخاطب کرنا پسند نہیں فرمایا اس وجہ سے اپنے پیغمبر کو خطاب کر کے ان بدعات سے احتراز کی تاکید فرما دی۔ یہ اسلوبِ کلام قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ (۱۹)

یہ لوگ کتنا ہی زور لگائیں لیکن ان کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لوگ خدا کے حضور میں تمہارے کچھ کام آنے والے نہیں بن سکیں گے۔ جو ذمہ داری اللہ نے تم پر ڈالی ہے اس کی بابت پرسش تمہی سے ہونی ہے، ان سے نہیں ہونی ہے اس وجہ سے اللہ کا جو حکم ہے اس کی تعمیل کرو۔ یہ لوگ خواہ مخالفت کر کے تمہیں دبانے کی کوشش کریں خواہ ہمدردانہ انداز میں تمہیں کچھ نرم کرنا چاہیں، کسی صورت میں بھی ان کی پروا نہ کرو۔

'وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ'۔ 'ظَالِمِيْنَ' سے مراد یہاں اہل کتاب اور مشرکین دونوں ہی ہیں، اس لیے کہ دونوں ہی اللہ کے دین کے معاملہ میں اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ فرمایا کہ ان ظالموں نے قرآن کی مخالفت کے لیے آپس میں گٹھ جوڑ بے شک کر لیا ہے لیکن اس سے ذرا بھی ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ اپنے خداترس بندوں (یعنی مسلمانوں) کا کارساز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا اہلِ ایمان کا کارساز ہے تو پھر وہ کسی سے کیوں ڈریں یا دبیں۔ وہ اپنے طریقہ پر کام کریں اللہ ہر مشکل میں ان کی مدد فرمائے گا۔ اور جن کی مدد پر اللہ ہو کس کی طاقت ہے کہ ان کو شکست دے سکے!

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۲۰)

قرآن کی آیات بصیرت بخش ہیں بشرطیکہ لوگ آنکھیں کھولیں

یہ اس قرآن کی طرف اشارہ ہے جس کی مخالفت کے لیے اہل کتاب، اور مشرکین نے مذکورہ متحدہ محاذ بنایا تھا۔ اوپر آیت ۱۱ میں بھی اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ 'هٰذَا' سے اشارہ قرآن کی طرف بحیثیت مجموعی ہے اور لفظ 'بَصَآئِرُ' قرآن کی آیات کو پیشِ نظر رکھ کر استعمال ہوا ہے جن کا کفار مذاق اڑانے کی کوشش کرتے تھے۔ فرمایا کہ یہ قرآن لوگوں کے لیے بصیرت بخش آیات کا مجموعہ ہے۔ اگر لوگ اس کا

مذاق اڑاتے اور ان کی مخالفت کرتے ہیں تو خود اپنی ہی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔ اس آیت کے اسلوب بیان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جہاں تک اس قرآن کی آیات کی بصیرت بخشی کا تعلق ہے وہ سورج کی طرح ہر شخص کے لیے عام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی مقصد سے اس کو اتارا ہے لیکن اس سے فیض انہی کو پہنچے گا جو اس سے کسب نور کے لیے اپنی آنکھیں کھولیں گے۔

'وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ'۔ فیضِ عام کے بعد یہ اس کے فیضِ خاص کا ذکر ہے کہ جو لوگ اس کے انذار اور اس کی بشارت کا یقین کریں گے ان کے لیے یہ ہدایت اور رحمت ہے۔ ہم دوسرے محل میں وضاحت کر چکے ہیں کہ ہدایت و رحمت کے الفاظ اس سیاق میں جہاں جہاں استعمال ہوئے ہیں دونوں الگ الگ مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی یقین کرنے والوں کے لیے یہ قرآن دنیا میں ہدایت اور آخرت میں رحمت ثابت ہوگا۔ دنیا میں یہ صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرے گا اور آخرت میں یہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتوں کے دروازے کھولے گا۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۲۱)

قیامت کے منکروں کا تصور خدا کے متعلق بالکل باطل ہے

یعنی جو لوگ قرآن کے انذار اور اس کی تبشیر کا مذاق اڑا رہے ہیں ان کا تصور گویا یہ ہے کہ جہاں کے خالق کے نزدیک مومن اور کافر، نیک اور بد، صالح اور طالح میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ دونوں کی زندگی اور موت بالکل یکساں ہے۔ فرمایا کہ اگر ان کا تصور یہ ہے تو یہ نہایت بُرا فیصلہ ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ یعنی یہ انسان کے اس شعورِ عدل کے بالکل منافی ہے جو انسان کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمایا ہے۔ کوئی شخص خواہ برائی کی زندگی گزارے یا بھلائی کی لیکن وہ اپنے دل کے اندر نیک اور نیکی کا احترام ضرور رکھتا ہے۔ جو شخص معاملات پر غیر جانبدارانہ نظر ڈالتا ہے وہ ہرگز اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ نیک اور بد دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جائے۔ ہر دور میں انسانوں نے جو قوانین جاری کیے ہیں ان میں یہ اصولِ عدل بنیادی طور پر ملحوظ رہا ہے۔ تو جو اصولِ عدل انسانوں کے اندر اس طرح مسلّم ہے اللہ تعالیٰ کے متعلق کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس سے عاری ہے؟ اگر نیک و بد دونوں اس کے نزدیک یکساں ہیں تو اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ یا تو نعوذ باللہ ظالم اور نامنصف ہے یا نیکی اور بدی کے معاملہ میں بالکل بے حس۔ اور یہ ایسی باتیں ہیں جن کا خدا کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر وہ عادل و منصف ہے تو ضروری ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں لوگوں کے درمیان بے لاگ انصاف کرے۔ ان لوگوں کو پورا پورا انعام دے جنھوں نے نیکی اور عدل کی زندگی گزاری اور ان لوگوں کو پوری سزا دے جنھوں نے فسق اور نافرمانی کی زندگی بسر کی۔ ایک ایسے دن کا ظہور اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ دنیا آزمائش کے قانون پر چل رہی ہے۔

اس میں نیک و بد دونوں کو مہلت ملی ہوئی ہے کہ خواہ وہ نیکی کی زندگی بسر کریں یا بدی کی، ضروری نہیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سزا دے جو برائی کی زندگی بسر کریں یا ان لوگوں کو صلہ دے جو نیکی کی زندگی گزاریں۔ اس کے لیے اللہ نے ایک خاص دن مقرر کر رکھا ہے۔ قرآن اسی دن کی سزا یا اس دن کے انعام سے لوگوں کو آگاہ کرنے یا اس کی بشارت دینے آیا ہے۔ پس جو لوگ اس انذار اور بشارت کا مذاق اڑا رہے ہیں وہ گویا یہ تصور رکھتے ہیں کہ اس کائنات کا خالق محض ایک کھلنڈرا اور تماشائی ہے جو دنیا کو پیدا کر کے اس کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ اس کے خیر اور شر سے اس کو کچھ بحث نہیں۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲۲)

نادانوں کے زعم کے علی الرغم خالق نے یہ دنیا بالحق پیدا کی ہے

یعنی نادانوں نے تو یہ گمان کر رکھا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو ایک غایت اور نہایت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس غایت و نہایت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان فیصلہ فرمائے اور ہر جان کو اس کے عمل کا بدلہ ملے، اس کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہو۔ اگر کوئی ایسا دن نہ آئے، یہ دنیا اسی طرح چلتی رہے یا چلتے چلتے بس یونہی ایک دن تمام ہو جائے، اس کے بعد نہ کوئی جزا ہو نہ سزا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ دنیا بالحق نہیں بلکہ ایک عبث اور باطل کارخانہ اور ایک کھلنڈرے کا کھیل ہے اور اس کا خالق ایک تماشا پسند ہے جس نے بالکل بے مقصد اتنا بڑا کارخانہ کھڑا کر دیا ہے۔

'بِالْحَقِّ' کے بعد 'لِيَفْصِلَ بَيْنَهُمْ' یا اس کے ہم معنی الفاظ میرے نزدیک محذوف ہیں۔ 'لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ' اسی محذوف پر معطوف ہے۔

'وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ' کی قید سے مقصود یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس دن ہر جان کے ساتھ بالکل بے لاگ انصاف ہو، کسی پہلو سے کسی کی کوئی حق تلفی نہ ہو۔ اگر اس حق تلفی کے لیے کوئی گنجائش باقی رہ جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ دنیا پھر بالکل عبث اور باطل ہو کے رہ جاتی ہے۔ یہ قید شرک و شفاعت کے ان باطل تصورات کی نفی کے لیے بڑھائی گئی ہے جن میں مشرکین بھی مبتلا تھے اور اہل کتاب بھی۔ ان تصورات کے ساتھ آخرت کو ماننا یا نہ ماننا دونوں یکساں تھا۔ جب عقیدہ یہ ہو کہ آدمی کے اعمال خواہ کچھ ہی ہوں شفعاء و شرکاء اپنی شفاعت اور زور و اثر سے بخشوا ہی لیں گے تو بے لاگ انصاف کہاں رہا! پھر تو ہر ظلم و ناانصافی کے لیے راہ کھل گئی۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲۳)

ایک برمحل اشارہ یہود کی طرف

اوپر کی آیت میں خاص طور پر مشرکین کے غلط تصورِ حیات پر ان کو ملامت تھی۔ اس آیت میں ان کی سرپرستی کرنے والے یہود کے بارے میں مسلمانوں کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ یہ اللہ کی کتاب کے مدعی ہوتے ہوئے مشرکین اور ان کے دینِ شرک کی حمایت جو کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بدعملیوں کی پاداش میں اللہ نے ان کے کانوں اور دلوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ تو جو خدا کے قانون کی زد میں آ چکے ہوں اب کس کے بس میں ہے کہ ان کو راہ راست پر لا سکے۔

'اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ'۔ 'اَفَرَءَيْتَ' کا اسلوب کسی کی حالت پر تعجب یا افسوس کے ساتھ توجہ دلانے کے لیے آتا ہے جس طرح ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں 'ذرا فلاں کو تو دیکھو' یا 'بھلا تم نے فلاں کو بھی دیکھا!' یہود کی حالت پر تعجب کے ساتھ اس لیے توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی کتاب و شریعت سے نوازا لیکن انھوں نے کتاب و شریعت کو تو پیٹھ پیچھے پھینکا اور اپنی خواہشوں اور بدعات کو معبود بنا بیٹھے۔ آدمی جب خواہشوں کا اس طرح فرمانبردار بن جائے کہ خدا کے صریح احکام کی بھی پروا نہ کرے۔ بلکہ خواہشوں ہی کے اندر اپنے لیے خیر و مصلحت سمجھنے لگے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کا بندہ نہیں بلکہ اپنی خواہشوں اور بدعتوں ہی کا بندہ ہے۔ یہود کی اس اہوا پرستی کا ذکر تفصیل سے سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

'وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ'۔ یعنی ان لوگوں کی محرومی یہ نہیں ہے کہ ان کو علم کی روشنی ملی نہیں بلکہ ان کی اصل بدبختی یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو علم دیا اس کی قدر کرنے کے بجائے انھوں نے اپنی خواہشوں اور بدعات ہی کی پیروی کی۔ اس ضلالت پسندی کی سزا ان کو یہ ملی کہ اللہ نے ان کو گمراہی کے لیے چھوڑ دیا۔ اوپر فرمایا ہے کہ 'وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ....' (۱۷) (اور ہم نے انھیں شریعتِ الٰہی کے نہایت واضح احکام دیے تو انھوں نے علم آ جانے کے بعد محض آپس کے عناد کے باعث اختلاف کیا) جو بات یہاں 'مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے وہی بات آیت زیرِ بحث میں 'عَلٰى عِلْمٍ' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے۔ یعنی یہ لوگ روشنی پانے کے بعد اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں تو ان سے اب کسی خیر کی امید نہ رکھو۔

'وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً'۔ بعینہٖ یہی مضمون سورۂ بقرہ آیت ۷ میں ان یہود ہی کے بارے میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم ختمِ قلوب کی حقیقت پر وضاحت سے بحث کر چکے ہیں۔ اس صفت کے ساتھ قرآن نے صرف یہود ہی کا ذکر کیا ہے۔

'فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ'۔ 'مِنْ' کے بعد ایک مضاف محذوف

ہے۔ یعنی 'مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَضَلَّهُ اللّٰهُ'۔ مطلب یہ ہے کہ جن کے دلوں پر سنت الٰہی کے تحت مہر ہو چکی ہو ان کو بھلا کون ہدایت دے سکتا ہے! ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے اس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ختم قلوب کی بحث پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

'اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ'۔ یہ مسلمانوں کو نصیحت بلکہ ایک قسم کی تنبیہ ہے کہ تمھیں یہ حیرانی کیوں ہے کہ یہ پڑھے لکھے اور کتاب و شریعت کے مدّعی لوگ قرآن کے دشمن اور مشرکین کے ساتھی بن کر کیوں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں! یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کو ہدایت بخشتا ہے جو اس کی ہدایت کی قدر کرتے ہیں۔ جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے ان کے لیے وہ ہدایت ہی ضلالت کا پھندا بن جاتی ہے۔ 'يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا' کے تحت اس حقیقت کی وضاحت ہو چکی ہے۔

## ۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۲۴-۳۷

آگے منکرین قیامت کے اس احمقانہ مطالبہ پر تبصرہ ہے کہ جب ان کو قیامت سے ڈرایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ قیامت کا آنا برحق ہے تو ہمارے بزرگوں کو زندہ کر کے دکھا دو۔ اس مطالبہ کی تردید کرتے ہوئے اس انجام کی تصویر کھینچی ہے جس سے قیامت کے منکرین کو لازماً دوچار ہونا پڑے گا۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ جس دن اس انجام سے سابقہ پیش آئے گا اس دن کوئی شریک و شفیع بھی خدا کی پکڑ سے بچانے والا نہیں ہوگا۔ اس دن فوزِ عظیم صرف ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو آخرت اور توحید پر ایمان رکھنے والے اور شرک و شفاعت پر اعتماد کرنے کے بجائے عمل صالح کی کمائی کرنے والے ہوں گے ——— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۴-۳۷

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

ع ۳ ۵ ۱۹

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ
يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿٢٧﴾ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۚ كُلُّ اُمَّةٍ
تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٨﴾
هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٩﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿٣٠﴾ وَ
اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۣ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ
وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿٣١﴾ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ
وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ
اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴿٣٢﴾ وَبَدَا لَهُمْ
سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٣٣﴾
وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَ
مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٣٤﴾ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ
اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ
فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿٣٥﴾ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ
رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٦﴾ وَلَهُ
الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٣٧﴾ ع ٤ ١١ ٢٠

ترجمۂ آیات ۲۴-۳۷

اور وہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے۔ یہیں

ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہم کو بس گردشِ روزگار ہلاک کرتی ہے۔ اور ان کو اس باب میں کوئی علم نہیں ہے محض اٹکل کے تیر تکّے چلا رہے ہیں! اور جب ان کو ہماری نہایت واضح آیات سنائی جاتی ہیں تو ان کا یہ قول ہی ان کی واحد حجّت ہوتا ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچّے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے ہمارے پاس لاؤ۔ ان کو بتا دو کہ اللہ ہی تم کو زندہ کرتا ہے پھر تم کو مارتا ہے پھر وہ تم کو روزِ قیامت تک، جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے، تم کو جمع کرے گا لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ ۲۴-۲۶

اور اللہ ہی کی ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور جس دن قیامت قائم ہو گی اس دن اہلِ باطل خسارے میں پڑیں گے اور تم دیکھو گے ہر گروہ کو دوزانو بیٹھے۔ ہر گروہ کو پکارا جائے گا اس کے دفترِ اعمال کی طرف۔ ان کو بتایا جائے گا کہ جو کچھ تم کرتے رہے ہو آج تم کو اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ یہ ہمارا دفتر ہے جو تمھارے اوپر بالکل ٹھیک ٹھیک گواہی دے گا۔ ہم لکھواتے رہے ہیں جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ ۲۷-۲۹

پس جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے ان کو ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یہی دراصل کھلی ہوئی کامیابی ہے۔ رہے وہ جنھوں نے کفر کیا تو ان سے کہا جائے گا کہ کیا تم کو میری آیتیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی رہی ہیں تو تم نے تکبر کیا اور تم مجرم لوگ تھے! اور جب تم سے کہا جاتا کہ اللہ کا وعدہ شدنی ہے اور قیامت کے باب میں کوئی شک نہیں ہے تو تم جواب دیتے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت

کیا ہے۔ بس ایک گمان ہے جو ہم کرتے ہیں اور ہم اس کا یقین کرنے والے نہیں ہیں۔ ۳۰-۳۲

اور ان پر ان کے ان کاموں کی برائیاں واضح ہو جائیں گی جو وہ کرتے رہے اور وہ چیز ان کو گھیر لے گی جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے اور ان سے کہا جائے گا کہ آج ہم تم کو نظر انداز کریں گے جس طرح تم نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا اور تمھارا ٹھکانا دوزخ ہے اور کوئی تمھارا مددگار نہیں بننے والا ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ تم نے اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا اور دنیا کی زندگی نے تم کو دھوکے میں ڈالے رکھا۔ پس آج نہ تو وہ اس سے نکالے جائیں گے اور نہ ان کو معذرت پیش کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ پس اللہ ہی، آسمانوں اور زمین کا خداوند، عالم کا رب، شکر کا سزاوار ہے اور اسی کے لیے ہے بڑائی آسمانوں اور زمین میں اور وہ عزیز و حکیم ہے۔ ۳۳-۳۷

---

## ۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۲۴)

منکرین قیامت کا معارضہ اور اس کا جواب

پیچھے آیات ۲۱-۲۲ میں قیامت کے اخلاقی، اور انفسی اور آفاقی دلائل کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔ اب یہ اس معارضہ کا حوالہ ہے جو ان واضح دلائل کے مقابل میں منکرین قیامت پیش کرتے تھے۔ فرمایا کہ جب ان کو قیامت کی یاد دہانی کی جاتی ہے تو بڑی رعونت کے ساتھ کہتے ہیں کہ زندگی تو بس اسی دنیا کی زندگی تک محدود ہے۔ اس زندگی کے بعد نہ زندگی ہے نہ موت۔ جو لوگ مرنے کے بعد پھر زندگی اور حساب کتاب کا ڈراوا سناتے ہیں وہ محض ایک دھونس جماتے اور ایک وہم میں مبتلا ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

'نَمُوْتُ وَنَحْیَا' یعنی ہمارا مرنا اور جینا بس اسی دنیا تک محدود ہے۔ مرجانے کے بعد سارا قصہ تمام ہوجاتا ہے۔

'وَمَا یُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ' اور یہ بات بھی بالکل غلط ہے کہ خدا ہمیں موت دیتا ہے، وہ ہمیں اکٹھا کر رہا ہے، پھر ایک دن وہ ہمارا حساب کتاب کرنے بیٹھے گا اور ہمیں جزا یا سزا دے گا۔ خدا کو ان باتوں سے کیا تعلق! بس گردش روزگار ہے جو ہمیں فنا کرتی ہے۔ جس طرح ایک درخت اگتا ہے، اپنی پختگی کو پہنچتا ہے، اور ایک دن سوکھ کر فنا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ہم بھی پیدا ہوتے ہیں، پھر گردشِ روزگار کے کسی تھپیڑے سے یا تو بچپن یا جوانی ہی میں فنا ہوجاتے ہیں یا بڑھاپے کو پہنچ کر مرجاتے ہیں۔

'وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ' یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی ان خرافات پر تبصرہ ہے کہ یہ جو کچھ کہا جارہا ہے اس کی بنیاد کسی علم پر نہیں ہے بلکہ محض اٹکل کے تیر تکے چلائے جارہے ہیں۔ ان کا جی قیامت کو ماننے کو نہیں چاہتا۔ یہ چیز ان کی آزادی کو مقید اور ان کے عیش کو منغص کرتی ہے اس وجہ سے بالکل بے سوچے سمجھے یہ لایا بالیا نہ باتیں کرتے اور ایک ایسی حقیقت کا انکار کر رہے ہیں جس کی شہادت انسان کی فطرت کے اندر ہے، جس کی گواہی اس کائنات کا پورا نظام دے رہا ہے، جو اس جہان کے خالق کی قدرت، حکمت، رحمت، ربوبیت اور اس کے عدل کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر وہ ظہور میں نہ آئے تو یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال اور ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عرب میں دہریوں کا بھی ایک گروہ تھا جو خدا اور قیامت وغیرہ کا قطعی منکر تھا۔ میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اشخاص و افراد کی بات اور ہے لیکن بحیثیت گروہ کے اس دور میں کوئی گروہ ایسا موجود نہیں تھا جو خدا اور آخرت کا صریح الفاظ میں منکر یا نرا مادہ پرست ہو۔ اہل عرب منکر نہیں بلکہ مشرک تھے اور اس شرک کے ذریعہ سے انھوں نے خدا کو دنیا کے نظام میں ایک عضوِ معطل بنا کے رکھ دیا تھا۔ آخرت اور حیات بعد الممات کے معاملہ میں بھی وہ قطعی انکار کے نتیجہ تک نہیں پہنچے تھے بلکہ تذبذب کے درجہ میں تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مرنے کے بعد از سرِ نو اٹھنا اول تو بہت مستبعد بات ہے اور اگر اٹھنا ہی پڑا تو ہمارا معاملہ خدا سے نہیں بلکہ ہمارے دیوتاؤں سے متعلق ہے۔ وہ ہمیں وہاں بھی اونچے سے اونچے درجے دلائیں گے۔ اور اگر خدا نے کوئی گرفت کی تو وہ اپنے زور و اثر سے ہمیں اس کی گرفت سے بچالیں گے۔

ان کا یہ قول کہ ہمیں گردشِ روزگار ہلاک کرتی ہے انکارِ خدا کے معنی میں نہیں تھا بلکہ اس سے وہ قرآن کے اس فلسفۂ تاریخ کی نفی کرنا چاہتے تھے جو قرآن نے نہایت تفصیل کے ساتھ قریش کو سنایا

تھا کہ پچھلی قومیں اپنے عقائد و اعمال کے فساد اور رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں تباہ ہوئیں۔ اگر تم بھی انہی کی روش اختیار کرو گے تو انہی کے انجام سے دوچار ہو گے۔ یہ انذار چونکہ بالکل مبنی بر حقیقت تھا اس وجہ سے وہ لوگ اس سے متاثر ہوئے جن کے اندر کچھ عاقبت اندیشی تھی۔ ان کے اندر یہ ڈر پیدا ہوا کہ قرآن کی یہ بات صحیح ہے اور اگر ہم نے بھی عاد، ثمود، اہلِ مدین اور فرعون کی طرح اس دعوتِ حق کو جھٹلایا اور اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح نہ کی تو مبادا اسی طرح کے کسی عذاب کی زد میں آجائیں جس سے قرآن ڈرا رہا ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو اپنی روش پر مطمئن رکھنے کے لیے قریش کے لیڈروں نے یہ فلسفہ تراشا کہ یہ بات بالکل غلط ہے کہ پچھلی قومیں اپنے عقائد و اعمال کے فساد اور رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں خدا کے عذاب سے تباہ ہوئیں۔ خدا کو ان باتوں سے کیا تعلق۔ ہم ہلاک ہوتے ہیں تو گردشِ روزگار سے ہلاک ہوتے ہیں۔ ایک شخص پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے، پھر بوڑھا ہو کر ایک دن مر جاتا ہے اور اس کے اس مر جانے کا کوئی تعلق بھی اس کے عقائد و اعمال سے نہیں بلکہ تمام تر گردشِ روزگار سے ہوتا ہے۔ اسی طرح قومیں بھی وجود میں آتی ہیں، ترقی کرتی ہیں، تہذیب و تمدن کی بانی بنتی ہیں، فتح و تسخیر کے جال بچھاتی ہیں اور ایک دن اپنی طاقتیں اور صلاحیتیں نچوڑ کر گردشِ روزگار کی نذر ہو جاتی ہیں۔ اس دنیا کے اسٹیج پر یہ تماشا برابر ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ یہ گردشِ روزگار کے کرشمے ہیں۔ جو لوگ اس چیز کو عقائد و اعمال سے باندھتے ہیں وہ بالکل وہمی اور لوگوں کو خواہ مخواہ ایک وہم میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔

قریش کے لیڈر اپنے اسی فلسفۂ باطل کو تقویت پہنچانے کے لیے اپنے عوام کو یہ سبق بھی پڑھاتے تھے کہ اگر کوئی قحط یا بلا یا طوفان آجائے تو اس وہم میں نہ مبتلا ہو جایا کرو کہ یہ چیز تمہارے اعمال یا عقائد کے فساد کے نتیجہ میں تم پر خدا نے نازل کی ہے۔ اس طرح کے سخت اور نرم دن ہمارے اگلوں پر بھی آئے حالانکہ تم جانتے ہو کہ وہ بڑے ہی پاکیزہ اعمال و عقائد والے لوگ تھے۔ قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ کے تحت ان کے اس فلسفہ کی وضاحت ہو چکی ہے۔

یہ خیال نہ فرمائیے کہ یہ جاہلی فلسفہ اب نابود ہو چکا ہے۔ اس زمانے میں بھی ذہنوں پر یہی فاسد فلسفہ مسلط ہے اور ان لوگوں کے ذہنوں پر مسلط ہے جو قرآن کے حامل اور اسلام پر عامل ہونے کے مدعی ہیں۔ ان کو بھی اگر توجہ دلائیے کہ فلاں فلاں آفتیں جو آئیں یا آ رہی ہیں یہ سب ہمارے ایمانی و اخلاقی فساد کا نتیجہ ہیں، اگر یہ فساد باقی رہا تو ڈر ہے کہ کہیں یہ بیڑا ہی غرق نہ ہو جائے تو اس سے ان کا پندارِ ایمان و اسلام مجروح ہوتا ہے اور وہ بڑے دانش فروشانہ انداز میں جواب دیتے ہیں کہ اس طرح کی گردشیں تو قوموں پر آیا ہی کرتی ہیں۔ ہمارے اگلوں پر بھی آ چکی ہیں، پھر یہ کیوں سمجھا جائے کہ یہ ہمارے کسی فساد کا نتیجہ ہیں!

'وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ'؛ یعنی یہ بات یہ لوگ کہتے تو ہیں بڑے ادعا و طنطنہ کے ساتھ لیکن اس باب میں ان کو کوئی علم نہیں ہے بلکہ محض ظن و گمان ہے جس پر اس فلسفہ کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ عقل و فطرت، آفاق و انفس اور انبیاء و حکما کی تعلیم تو وہی ہے جو قرآن پیش کر رہا ہے لیکن یہ لوگ علم کی جگہ اپنے گمان کی پیروی کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہ ان کی ہر خواہش کے جواز کی سند علم نہیں بلکہ ان کا گمان ہی دے سکتا ہے۔ یہ اسلوب کلام اظہار حسرت کا ہے کہ بڑے ہی بدقسمت ہیں یہ لوگ جنھوں نے ایسے عظیم معاملہ میں علم کی جگہ اپنے خیال و گمان کو اپنا رہنما بنایا ہے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۵)

قرآن کے دلائل کے مقابل میں کفار کی واحد ڈھال

یہ ان کے اس گمان کی وضاحت ہے جس کو انھوں نے قرآن کے واضح دلائل کے مقابل میں اپنا رہنما بنایا۔ فرمایا کہ جب قیامت کے باب میں ان کو ہماری نہایت واضح آیتیں سنائی جاتی ہیں تو واحد چیز جس کو وہ ان کی تردید میں اپنی حجت بناتے ہیں وہ پیغمبرؐ اور ان کے ساتھیوں سے ان کا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ اگر تم لوگ اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو جو وفات پا چکے ہیں، زندہ کر کے لاؤ۔

'حُجَّتَهُمْ' کان کی خبر ہے۔ یہی مضمون سورۂ عنکبوت میں بھی ذرا مختلف الفاظ میں آیا ہے: 'فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ' (۲۹) (ان کی قوم کا جواب صرف ان کا یہ قول ہوا کہ اگر تم سچے ہو تو اللہ کا عذاب ہم پر لا دکھاؤ)۔ 'حُجَّت' سے مراد ان کا جواب ہی ہے لیکن اپنے زعم میں وہ اس کو ایک قاطع حجت خیال کرتے تھے اس وجہ سے 'بطور طنز' قرآن نے اس کو 'حجت' سے تعبیر فرمایا۔ مقصد یہ دکھانا ہے کہ اتنے بڑے مسئلہ میں اگر انھوں نے سہارا لیا تو ایک ایسے جواب کا سہارا لیا جس کو نہ اصل بحث سے کوئی دور یا قریب کا واسطہ ہے اور نہ عقل و منطق سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ بلکہ یہ محض ان کا ایک بے بنیاد خیال ہے لیکن یہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ قرآن جس چیز سے ڈرا رہا ہے اس سے ان کی جان چھوٹ گئی۔

قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۶)

قرآن کا جواب

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اصل دعوے کی از سر نو یاد دہانی کرائی گئی اور ایسے اسلوب میں کرائی گئی ہے کہ دعوے کی دلیل خود بخود واضح ہو گئی ہے۔ فرمایا کہ تم سے یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ آج جس کو کہو اس کو زندہ کر کے دکھا دیا جائے بلکہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ہی تمہیں زندگی دیتا ہے، پھر وہی تم کو موت بھی دیتا ہے پھر وہ تم کو جمع کرے گا اور یہ جمع کرنا قیامت کے دن تک جاری

رہے گا اور قیامت کے آنے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

یعنی جب زندگی اور موت خدا ہی کے اختیار میں ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو یہ سوال تو خارج از بحث ہوا کہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ لوگوں کو زندہ کر سکتا ہے یا نہیں؟ آخر جس نے زندہ کیا ہے، وہ دوبارہ زندہ کیوں نہیں کر سکتا؟ اور جب اپنے پیدا کیے ہوئے کو موت بھی اسی نے دی ہے، کسی اور نے نہیں دی ہے تو وہ اگر اس کو دوبارہ پیدا کرنا چاہے تو اس کے اس ارادے میں کس کی طاقت ہے کہ مزاحم ہو سکے! مزاحمت تو جب ہو سکتی کہ زندگی پر کسی کا اختیار ہوتا اور موت پر کسی اور کا۔ لیکن ناقابلِ تردید دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ اس قسم کی ثنویت سے یہ کارخانۂ کائنات بالکل پاک ہے۔ یہ اپنے وجود سے شاہد ہے کہ اس کے اوپر ایک ہی ارادہ کارفرما ہے۔

'ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ' یہ زندگی اور موت کے لازمی تقاضے کا بیان ہے کہ اس کے بعد اگر حساب کتاب اور جزا و سزا کا کوئی دن نہ آئے تو یہ سارا کارخانہ بالکل عبث اور بے مقصد ہو کے رہ جاتا ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک دن سب کو جمع کرے اور یہ جمع کرنا اس قیامت کے دن تک جاری رہے گا جس کا آنا اس زندگی اور موت کے بامقصد ہونے کے لیے ناگزیر اور جس کے آنے میں کسی پہلو سے کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔

'يَجْمَعُكُمْ' کے بعد 'اِلیٰ' کا صلہ اتصال اور تسلسل کو ظاہر کر رہا ہے۔ یعنی یہ جمع کرنا قیامت تک جاری رہے گا جس سے یہ بات بھی نکلی کہ مرنے والوں میں سے قیامت سے پہلے نہ کوئی اٹھے گا اور نہ کسی کے اٹھائے جانے کا قرآن یا پیغمبر کی طرف سے دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کے باپ دادا کو زندہ کر کے دکھا دیا جائے ان کا مطالبہ بے معنی ہے۔

'وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ'۔ یہ منکرینِ قیامت کے حال پر اظہارِ حسرت ہے کہ جس چیز سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے اس میں کسی شک کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یعنی اس بات کو نہیں جانتے کہ اس واضح حقیقت کا انکار کر کے اپنے لیے کس ہولناک انجام کا دروازہ کھول رہے ہیں۔

وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَخْسَرُ الْمُبْطِلُونَ (۲۷)

یعنی اگر ان لوگوں کا بھروسا اپنے مزعومہ شرکاء پر ہے کہ قیامت ہوئی تو وہ ان کو بچا لیں گے تو یہ محض ایک خیالِ خام ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ کسی کی بھی مجال نہیں ہے کہ اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ وہ دن جب آئے گا تو جو لوگ، اس قسم کی جھوٹی آرزوؤں میں مبتلا رہے ہیں وہ سب خسارے میں پڑیں گے۔

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۸)

تصویر قیامت

اس دن لوگوں کو جس صورت حال سے سابقہ پیش آئے گا یہ اس کی تصویر ہے۔ فرمایا کہ اس دن ہر گروہ اپنا فیصلہ سننے کے لیے دو زانو بیٹھا ہوا ہوگا، ہر گروہ اپنے اپنے دفتر اعمال کی طرف پکارا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ آج تمہیں بدلے میں وہی ملے گا جو تم دنیا میں کر کے آئے ہو۔

'تَرٰى' اگرچہ واحد کا صیغہ ہے لیکن 'اَلَمْ تَرَ' کی طرح اس کا خطاب بھی عام ہو سکتا ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہاں عام ہی ہے۔

'كُلَّ اُمَّةٍ' یعنی مومن اور کافر، ابرار اور فجار اس دن سب اکٹھے ہوں گے، کوئی بھی اس حاضری سے مستثنیٰ نہیں ہوگا۔

'جَاثِيَةً'، 'جثا یجثو' سے ہے۔ 'جثا الرجل' کی تشریح اہل لغت نے یوں کی ہے کہ 'جلس علیٰ رکبتیہ' آدمی اپنے دونوں زانوؤں پر بیٹھا۔ غلام، محکوم اور مجرم اپنے آقاؤں اور حاکموں کے حضور میں اپنا فیصلہ سننے کے لیے اسی طرح دو زانو بیٹھتے تھے۔

'کتابہا' یہاں دفتر اعمال کے مفہوم میں ہے۔ اس لیے کہ اس 'کتاب' میں گروہوں اور امتوں کے تمام اعمال کا ریکارڈ ہوگا جس کی موزوں تعبیر دفتر ہی سے ہو سکتی ہے۔ سورہ تطفیف کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس کی وضاحت آئے گی۔ وہاں ان دفتروں کے نام بھی مذکور ہیں۔

'اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ'۔ 'اَلْيَوْمَ' سے پہلے 'قِيْلَ لَهُمْ' (ان سے کہا جائے گا) بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ یعنی ہر گروہ کو ان کے اعمال سے متعلق دفتر کی طرف پکارا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم دنیا میں کر کے آئے ہو آج تم کو وہ بدلہ میں ملے گا۔

مطلب یہ ہوا کہ جس نے کیا کرایا کچھ نہیں، صرف شرک و شفاعت کے بھروسہ پر وہ لذیذ خواب دیکھتا رہا ہے اس کے لیے یہاں محرومی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۹)

یہ بھی اوپر والی بات ہی کا حصہ ہے۔ یعنی ان کو آگاہ کر دیا جائے گا کہ اس دفتر سے کسی ناانصافی یا کسی سہو و نسیان کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ٹھیک بتائے گا کہ کس نے کیا کیا ہے اس لیے کہ ہر ایک کا سارا ریکارڈ مکمل تحریری موجود ہے۔ تم جو کچھ کرتے رہے ہو ہم اس کو برابر فرشتوں سے لکھواتے رہے ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ (۳۰)

ہر گروہ کو اس کے ریکارڈ سے آگاہ کر دینے کے بعد اب ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ انجام بیان ہو رہا ہے۔ پہلے اہل ایمان کا انجام بیان ہوا۔ فرمایا کہ جن لوگوں نے ایمان اور عمل صالح کی زندگی گزاری ہو گی ان کو ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ لفظ 'رحمت' یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ان لوگوں کو صرف ان کے اعمال ہی کا بدلہ نہیں ملے گا بلکہ اس کے ساتھ ان کے رب کا بے پایاں فضل بھی ہو گا۔ اس کے بعد بطور تحسین فرمایا کہ کھلی ہوئی کامیابی یہ ہے جو یہ لوگ حاصل کریں گے نہ کہ اس دنیا کا وہ چند روزہ عیش جس کے عشق میں پھنس کر نادانوں نے یہ ابدی بادشاہی گنوا دی!

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (۳۱)

یہ کفار کے انجام کا بیان ہے اور ان کا انجام اہل ایمان کے مقابل میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اس سورہ میں اصلی بحث کفار ہی سے ہے اور خاص طور پر ان کے متکبرین کے طبقہ سے۔ فرمایا کہ رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تو ان سے کہا جائے گا کیوں کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس دن سے آگاہ کرنے کے لیے جب تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں تو تم نے تکبر کیا اور ہماری تنبیہ و تذکیر کے باوجود تم بدستور اپنے جرم پر مصر رہے! اس تکبر اور اصرار کی تفصیل اسی سورہ کی آیات ۸-۹ اور ۲۴-۲۵ میں گزر چکی ہے۔ اس مرحلہ میں ان لوگوں سے یہ سوال ظاہر ہے کہ جواب حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا جائے گا بلکہ مقصود صرف ان کو ملامت کرنا ہو گا تاکہ ان کی رسوائی میں مزید اضافہ ہو۔

وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ (۳۲)

متکبرین کا احمقانہ مطالبہ

یہ ان کے استکبار کی وضاحت ہے کہ تمھارا حال یہ رہا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدۂ جزا و سزا شدنی اور قیامت کے واقع ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے تو تم بڑی رعونت سے یہ جواب دیتے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کس چیز کا نام ہے، بس ایک گمان ہے جو ہم رکھتے ہیں اور ہم اس کا یقین کرنے والے نہیں ہیں۔

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ جہاں تک گمان کا تعلق ہے یہ منکرین بھی اپنے دل میں رکھتے تھے لیکن ان کا مطالبہ یہ تھا کہ جب ان کو اس کا پورا یقین ہو جائے گا تب وہ مانیں گے۔ اس یقین کے لیے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ 'اِئْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ' (اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے دکھا دو) ظاہر ہے کہ یہ ایک بالکل ہی احمقانہ مطالبہ تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان صرف اسی چیز کو مانے جو اس نے آنکھوں سے دیکھی ہو۔ اس کے علاوہ کسی بات پر بھی یقین نہ کرے خواہ اس کے حق میں کتنے ہی واضح عقلی و اخلاقی دلائل موجود ہوں۔ اگر انسان اس حد تک سفاہت پر اتر آئے

تو پھر عقل ایک بالکل فالتو چیز بن کے رہ جاتی ہے بلکہ آدمی اور بیل میں پھر شکل و صورت کے سوا کوئی فرق ہی نہیں رہ جاتا۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ انسان اپنے اندر عقل کے وجود کو بھی تسلیم نہ کرے اس لیے کہ عقل کو بھی نہ اس نے دیکھا ہے نہ چھوا ہے۔ انسان کے پاس علوم کا جو سرمایہ ہے اس کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کا بہت بڑا حصہ عقلی اور اخلاقی اصولوں ہی پر مبنی ہے۔ اگر محسوس پرستی کا وہ نظریہ مان لیا جائے جو ان منکرین کے سامنے تھا تو دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ سارے علوم دفن کر دیے جائیں جو انسان نے اب تک پیدا کیے ہیں۔

دانش مندی کا راستہ

غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی آپ پر واضح ہوگی کہ اس طرح کے اہم اور دور رس نتائج رکھنے والے امور میں ظن غالب کی رہنمائی کافی ہے۔ ایک عظیم بند جس میں شگاف پڑنے سے پورا شہر خطرہ میں پڑ سکتا ہو ہماری توجہ کا طالب اسی وقت نہیں ہوگا جب اس میں شگاف پڑ جائے بلکہ عاقل لوگ اس طرح کے معاملات میں بہت پہلے سے چوکنے رہتے ہیں۔ آخرت کا معاملہ ایک نہایت اہم بلکہ اس پوری کائنات کا سب سے اہم معاملہ ہے۔ اس کے حق میں جو دلائل قرآن اور دوسرے صحیفوں میں بیان ہوئے ہیں وہ ناقابلِ تردید ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کوئی شخص کچھ کہہ سکتا ہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ اس پر اس کو اس طرح کا یقین نہیں ہے جس طرح کا یقین آنکھوں دیکھی چیز پر ہوتا ہے۔ اگر اس طرح کا یقین نہیں ہے تو نہ ہو، یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا وہ پوری قطعیت کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ آخرت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی موازنہ کرے کہ دونوں راہوں میں سے سلامتی کی راہ کون سی ہے۔ یہ کہ آدمی فکرِ آخرت کو بالائے طاق رکھ کر اپنی خواہشوں کی پیروی میں زندگی گزارے اور اس بحث میں نہ پڑے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا یا یہ کہ آخرت کو مان کر، جزا اور سزا کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، زندگی گزارے اگرچہ اس کے لیے اس کو اپنی بعض خواہشوں کی قربانی بھی دینی پڑے۔ غور کیجیے تو دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ آدمی یہ دوسری راہ اختیار کرے اس لیے کہ پہلی صورت اختیار کرنے میں ایک ابدی اور دائمی خطرہ مضمر ہے اور فائدہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ اپنے زعم کے مطابق اپنی خواہشوں کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہوں گے اگرچہ ان کا پورا ہونا آپ کے ارادہ پر منحصر نہیں ہے۔ برعکس اس کے اس دوسری راہ میں خطرہ کوئی نہیں ہے۔ اگر آخرت ہوئی تب تو ابدی بادشاہی حاصل ہوگی اور اگر منکرین کے خیال کے مطابق نہ ہوئی تو نقصان کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ یہی تو کہ اس فانی زندگی میں چند فانی خواہشوں کی قربانی دینی پڑی اور ان کا پورا ہونا بھی اپنے اختیار میں نہیں بلکہ کسی اور ہی کے اختیار میں تھا۔

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۳۳)

انسان جو عقلی و اخلاقی جرائم اس دنیا میں کرتا ہے ان کے بُرے نتائج اس کے سامنے فوراً نہیں

آتے اس وجہ سے ان کے معاملہ میں وہ دلیر ہوتا جاتا ہے اور ناصحوں کی نصیحت قبول کرنا تو درکنار وہ ان کو بے وقوف سمجھتا اور ان کی باتوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اعمال کے حقیقی نتائج سے پردہ اٹھا دے گا۔ اس دن اندھے سے اندھے کو بھی نظر آجائے گا کہ اس نے دنیا میں جو بس بھر فصل بوئی اور جس کے انجام سے اس کے رسولوں اور اس کے نیک بندوں نے اس کو ڈرایا لیکن اس نے ان کی کوئی پروا نہ کی، اس کا حاصل کس ہولناک شکل میں اس کے سامنے آیا۔ اس دن وہ عذاب، جس کا وہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ مذاق اڑاتا رہا اس کو اس طرح گھیرے گا کہ اس کے سامنے کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہے گی۔

وَقِيلَ الْيَوْمَ نَنسَاكُمْ كَمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن نَّاصِرِينَ (۳۴)

'نسی'، یہاں نظر انداز کرنے کے مفہوم میں ہے یعنی ان کو پہلے ہی مرحلہ میں آگاہ کر دیا جائے گا کہ جس طرح تم نے دنیا میں اللہ کے رسولوں اور اس کے نیک بندوں کے انذار کو نظر انداز کیے رکھا اور اس ہولناک دن کی پیشی سے انھوں نے تم کو آگاہ کیا تو تم نے سنی ان سنی کر دی اسی طرح آج ہم تم کو نظر انداز کریں گے۔ تم کتنا ہی چیخو اور چلاؤ لیکن ہمارے ہاں تمھاری کوئی شنوائی نہیں ہونی ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ اگر تم کو اپنی جمعیت پر ناز تھا تو وہ بھی آج تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتی اور اگر اپنے شرکاء و شفعاء پر بھروسہ تھا تو وہ بھی تمھارے کچھ کام آنے والے نہیں بنیں گے۔

ذَٰلِكُم بِأَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا وَغَرَّتْكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ (۳۵)

یعنی تم اس رویہ کے سزاوار اس وجہ سے ٹھہرے کہ جب تم کو اس دن سے آگاہ کرنے کے لیے اللہ کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی تھیں تو تم ان کا مذاق اڑاتے اور اس طرح وہاں سے چل دیتے گویا تم نے کوئی بات سنی ہی نہیں۔ آیات ۸-۹ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔

'وَغَرَّتْكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا' یعنی تم کو دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو ظاہیت و خوش حالی بخشی اس سے تم نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ تم اسی کے سزاوار و حقدار ہو اور تمھاری یہ خوش حالی اس بات کا ثبوت ہے کہ تمھارے عقیدہ یا عمل میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اس غرور میں مبتلا ہو کر تم نے ان لوگوں کا مذاق اڑایا، جنھوں نے تمھارے عقائد و اعمال کے فساد کی طرف تم کو توجہ دلانے کی کوشش کی اور ان کو یہ طعنہ دیا کہ بتاؤ ہمارے حالات اچھے ہیں یا تمھارے؟ جب ہمارے حالات تم سے بدرجہا بہتر ہیں تو ہم یہ کیوں نہ سمجھیں کہ ہمارے ہی عقائد و اعمال بھی اچھے ہیں اور خرابی ہمارے اندر نہیں بلکہ تمھارے ہی دماغوں کے اندر ہے۔

'فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ'۔ فرمایا کہ ان کے اس غرور کی پاداش میں نہ تو ان کو دوزخ سے نکلنا نصیب ہوگا اور نہ ان کو یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنے رب سے معافی مانگ کر اس

کو راضی کر سکیں تو راضی کر لیں۔ بلکہ ان کے لیے امید کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔

اس ٹکڑے میں اسلوب کی اچانک تبدیلی قابلِ توجہ ہے۔ اوپر کے ٹکڑے میں اسلوب خطاب کا تھا۔ اس میں دفعۃً غائب کا اسلوب آ گیا۔ گویا نظر انداز کیے جانے کی جو دھمکی ان کو دی گئی تھی اس کا عمل شروع ہو گیا یہاں تک کہ وہ اس قابل بھی نہیں رہے کہ ان کو خطاب کر کے کوئی بات کہی جائے۔ یہاں ملحوظ رہے کہ غائب کا اسلوب نظر انداز کیے جانے کے مواقع میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَلَهُ الْكِبْرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۪ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۳۶-۳۷)

یہ آخر میں ساری بحث کا خلاصہ سامنے رکھ دیا کہ جب یہ سارے حقائق بالکل واضح ہیں تو بندوں کے شکر کا سزاوار وہی اللہ ہے جو آسمانوں کا خداوند، جو زمین کا خداوند اور جو عالم والوں کا خداوند ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پھر اس کے سوا تم نے دوسرے ارباب کہاں سے نکال لیے؟ آسمانوں اور زمین کے الگ الگ الٰہ کس طرح ٹھہرا لیے؟ اور خدا کی مخلوق اور اس کے مربوب ہو کر تم نے اتنے دیوی دیوتا کس لیے ایجاد کر لیے؟

وَلَهُ الْكِبْرِیَآءُ ۔۔۔ الآیۃ' یہ اوپر والی بات کا دوسرا لازمی نتیجہ بیان ہوا کہ جب اس ساری کائنات کا خداوند وہی ہے تو اصل مالک اور بادشاہ کے ہوتے آسمانوں یا زمین میں کسی دوسرے کی کبریائی اور بڑائی کے لیے گنجائش کہاں سے نکلی؟ پھر تو ساری کبریائی کا حق دار وہی ہوا، سب کو اسی کے آگے سرنگندہ ہونا اور اسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ اگر کوئی اس کی مملکت کے اندر اس کے مقابل میں سر اٹھاتا ہے تو وہ اس کی کبریائی کو چیلنج کرتا ہے اور جو اس کی کبریائی کو چیلنج کرے گا وہ لازماً کیفرِ کردار کو پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ 'عزیز' یعنی غالب و مقتدر ہے اس وجہ سے کوئی اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتا لیکن ساتھ ہی وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے اگر اس نے لوگوں کو سرکشی کے لیے مہلت دے رکھی ہے تو اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ خدا کی گرفت سے باہر ہو گیا بلکہ اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے اور یہ حکمت ایک دن سب کے سامنے ظاہر ہو کے رہے گی۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر اللہ تعالیٰ کی توفیق و رہنمائی سے تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہٖ۔

رحمان آباد

۲۱ر جون ۱۹۷۶ء

۲۲ر جمادی الثانی ۱۳۹۶ھ